مطالب
ضربِ کلیم
مولانا غلام رسول مہر

شارح ------------ مولانا غلام رسول مہر

طابع ------------ شیخ نیاز احمد

مطبع ------------ علمی پرنٹنگ پریس، لاہور

اشاعتِ اوّل ------------ سنہ ۱۹۵۶ء

اشاعتِ دوم ------------ سنہ ۱۹۶۳ء

اشاعتِ سوم ------------ سنہ ۱۹۶۶ء

اشاعتِ چہارم ------------ سنہ ۱۹۶۸ء

" " پنجم ------------ سنہ ۱۹۸۲ء

کتابت ------------ صغیر احمد خاں شروانی

قیمت ------------ ۲۵/ روپے

شیخ غلام علی اینڈ سنز، پبلشرز
ادبی مارکیٹ، چوک انارکلی لاہور

فہرست مضامین

مطالب ضربِ کلیم

اعلیٰ حضرت نواب سر حمید اللہ خاں فرماں روائے بھوپال کی

خدمت میں

ضربِ کلیم اس دور میں لکھی گئی، جب اقبال گلا بیٹھ جانے کے باعث بیرسٹری چھوڑ چکے تھے، اس لیے کہ عدالت میں مقدمات کی پیروی نہیں کر سکتے تھے۔ اعلیٰ حضرت نواب سر حمید اللہ خاں مرحوم فرمانروائے بھوپال سے اقبال کے دیرینہ دوستانہ مراسم تھے۔ نواب موصوف نے اپنے زیرِ اہتمام اقبال کا علاج بھی کرایا، لیکن بحالیِ صحت کی ایسی صورت پیدا نہ ہوئی کہ وہ اپنا قانونی کاروبار شروع کر سکتے۔ نواب صاحب نے دوستانہ تعلقات کی بنا پر ان کے لیے پانچ سو روپے ماہانہ کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ حالانکہ اقبال نے اشارۃً یا کنایتہً اس کے لیے کوئی درخواست نہیں کی تھی۔ نواب صاحب اس سے زیادہ وظیفہ دینے کے آرزومند تھے، لیکن حالات ایسے پیش آ گئے کہ نہ وہ اس رقم کو بڑھا سکے، نہ اقبال نے اس میں اضافہ منظور کیا۔

اقبال نے "ضربِ کلیم" نواب صاحب کے نام منسوب کی اور یہ تین شعر انتسابی ہیں۔

۱۔ زمانے نے ایشیا کی قوموں سے اب تک جو سلوک کیا اور کر رہا ہے، کوئی نہ تھا جو یہ درد بھری داستان تفصیل سے سنا سکتا۔ آخر مجھی کو یہ فرض انجام دینا پڑا۔

۲۔ حمید اللہ خاں! تو صاحبِ نظر ہے اور تجھے خدا نے وہ ملکہ عطا کیا ہے کہ جو حقیقتیں میرے ضمیر کی گہرائیوں

میں موجود ہیں، تیرا دل انھیں دیکھ رہا ہے اور تیرا دماغ ان سے آگاہ ہے۔

۳۔ میں بہار کا یہ سرمایہ لایا ہوں تو اسے لے لے، اس لیے کہ پھول تیرے ہاتھ میں دے دیا جائے تو وہ شاخ سے بھی زیادہ تروتازہ اور شاداب رہتا ہے۔

اس شعر کا دوسرا مصرع طالب آملی کا ہے۔ پورا شعر یوں ہے:

زغارت چمنت بر بہار منّت ہاست
کہ گل بدستِ تو از شاخِ تازہ تر ماند

یہ مسلّم ہے کہ پھول اسی وقت تک تروتازہ رہتا ہے جب تک شاخ سے پیوستہ ہو۔ اسے توڑ لیا جائے تو تھوڑی دیر کے بعد افسردہ و پژمردہ ہونے لگتا ہے۔ جس ہاتھ میں ٹوٹا ہوا پھول شاخ سے بھی زیادہ تروتازہ رہے اس کی جتنی زیادہ تعریف کی جائے کم ہے۔ اقبال کا مقصد یہ ہے کہ میں ایشیا کی قوموں کے لیے زندگی کی جو گراں قدر متاع لے کر آیا ہوں، وہ حمید اللہ خاں کے ذریعے سے بہتر طریق پر اشاعت پا سکے گی اور زیادہ وسیع حلقے میں پھیل سکے گی۔

ناظرین سے

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ناظرین سے عموماً ایشیائی قومیں مراد ہیں اور خصوصاً مسلمان۔ اِن شعروں میں بتایا گیا ہے کہ "ضربِ کلیم" کا مقصد و نصب العین کیا ہے؟ یہ کیا تعلیم دیتی ہے اور کس طرف رہنمائی کرتی ہے؟

زجاج: شیشہ

جل ترنگ: لفظی معنی پانی کی تیز لہر۔ اصطلاح میں ایک باجے کا نام ہے۔ آٹھ دس پیالیاں یا گلاس لے کر ان میں پانی اس طرح ڈالا جاتا ہے کہ ہر پیالی یا گلاس میں اس کا درجہ مختلف ہو۔ پھر لکڑی کی نازک اور سُبک تیلیاں لے کر انھیں خاص ترکیب سے بجایا جاتا ہے۔ چونکہ مختلف پیالیوں یا گلاسوں میں پانی کے درجے مختلف ہوتے ہیں، اس لیے ان سے آوازیں بھی الگ الگ پیدا ہوتی ہیں۔ مشاق بجانے والا انھیں مختلف آوازوں کی ترکیب سے دل کشا نغمہ پیدا کر لیتا ہے۔ گویا ان پیالیوں یا گلاسوں کی حیثیت وہی ہوتی ہے جو ہارمونیم میں پردوں کی۔

اقبال نے اسی جل ترنگ سے "لہو ترنگ" کی ترکیب پیدا کر لی، یعنی وہ باجا جو پیالیوں یا گلاسوں میں پانی بھر کر نہیں بلکہ لہو بھر کر بجایا جائے۔

۱۔ جب تک تجھے زندگی کی حقیقتوں سے آگاہی حاصل نہ ہو، تیرا شیشہ پتھر سے ٹکرانے کی قوت پیدا نہیں کر سکتا۔

۲۔ ہم اس حالت پر پہنچے ہوئے ہیں، جہاں زورِ بازو اور کاری ضرب کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ یہ جنگ کا میدان ہے۔ اسے مخاطب! اس موقع پر ساز کے نغموں کا طلب گار نہ بن۔ ساز کے نغمے محفلوں میں سنے جاتے ہیں۔ میدانِ جنگ میں قوت اور زد و خورد کے سوا کچھ کارگر نہیں۔

۳۔ زندگی کا سرمایہ دل اور جگر کے خون سے پیدا ہوتا ہے یعنی زندگی میں اسی کو فروغ حاصل ہوتا ہے جس میں بہادری، جوانمردی، جفاکشی اور محنت و مشقت کی خصوصیتیں موجود ہوں۔ اسے غافل! فطرت جل ترنگ سے نہیں، لہو ترنگ سے کام لیتی ہے۔

تمہید

(۱)

خاوراں: سرزمینِ مشرق یعنی ایشیا۔ **تریاکی:** افیونی۔

۱۔ کعبہ ہو یا بت خانہ۔ کہیں بھی خودی بیدار نظر نہیں آتی۔ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، سب کی حالت ابتر ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام مشرقی قوموں کی روحوں نے افیون گھول کر پی لی ہے اور وہ بالکل بے حس و حرکت پڑی نظر آتی ہیں۔

۲۔ یہ دُنیا ہنگاموں کا گھر ہے۔ اگر تو ان ہنگاموں کے بے تکلف مقابلے سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا تو تیرے لیے یہ ہرگز اچھا نہیں کہ آسمانوں پر اڑنے والے افکار و خیالات میں مست اور مگن رہے۔

مطلب یہ ہے کہ فلسفہ، حکمت، شاعری یا اس قسم کے دوسرے علوم میں مشغول ہونا اسی وقت زیبا ہے کہ قوم آزادی کی دولت سے مالا مال ہو اور اس کی زندگی کا کاروبار اطمینان سے جاری ہو۔ جو قومیں محکومی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہیں اور انھیں اپنی مرضی کے مطابق سانس لینے کا بھی موقع حاصل نہیں۔ وہ افکار و خیالات میں گم رہیں گی تو ان کی قوتِ عمل اور بھی افسردہ و پژمردہ ہو جائے گی اور ان کی مصیبتوں کا جنجال کبھی ختم نہ ہوگا۔

۳۔ جو شے افراد اور قوموں کی عملی قوت کو ملیا میٹ کر ڈالتی ہے، وہ موت کا غم ہے۔ اے مخاطب! تو جب تک خودی کو خاکی جسم سمجھتا رہے گا، ممکن نہیں کہ موت کے غم سے نجات حاصل کرے۔

مُراد یہ ہے کہ موت جسم پر آتی ہے، رُوح پر نہیں آتی۔ جو شخص خودی کو جسم نہیں رُوح سمجھتا ہے، وہ کبھی غمِ مرگ میں مبتلا نہیں ہو سکتا۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضورؐ نے صحابہؓ سے فرمایا: مجھے تمھارے متعلق وھن کا اندیشہ ہے۔ پوچھا گیا: حضورؐ! وھن کیا ہے؟ فرمایا: حبّ الدنیا و کراھۃ الموت — دنیا سے محبت اور موت سے گریز۔ اسی حدیث کے پیشِ نظر اقبالؔ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی تھی:۔

اے تو مابے چارگاں را ساز و برگ | وا رہاں ایں قوم را از ترس مرگ

قوموں کی زندگی کا راز صرف یہ ہے کہ وہ موت سے بے پروا ہو جائیں، پھر ان کی قوت کا مقابلہ غیر ممکن ہو جاتا ہے۔ موت کے غم سے وہی رہا ہو سکتے ہیں جو زندگی کو مادیت سے بالاتر سمجھیں۔

۴۔ یہاں جو واقعات پیش آ رہے ہیں، زمانہ ان پر پردہ نہیں ڈال سکتا اور انھیں چھپا نہیں سکتا، لیکن اے مخاطب! تیرا دل اور تیری نظر پاک نہیں۔ اسی وجہ سے واقعات و حوادث کی حقیقت تیری نظروں سے اوجھل ہے۔

۵۔ مجھے اس لیے ایشیا کا گھاس پھوس عطا کیا گیا ہے کہ میرے نغموں کے شعلے بہت سرکش اور بیباک تھے۔ عام تجربہ یہ ہے کہ جلتی آگ پر گھاس پھوس ڈال دیا جائے تو شعلے تھوڑی دیر کے لیے دب جاتے ہیں، صرف تیز شعلے اسے جلا سکتے ہیں۔ اقبال کا شعلہ تیز نہ ہوتا تو ایشیا کے گھاس پھوس میں زندگی کی حرارت کیونکر پیدا کر سکتا۔

(۲)

کوکنار: پوست

۱۔ اے اقبال! اگرچہ تو بھی زمانے کی طرح لوگوں سے کم میل جول رکھتا ہے، لیکن تیرا یہ گناہ سب پر آشکارا ہے کہ تو نے محفلیں سجا رکھی ہیں اور اپنے افکار و خیالات پھیلا رہا ہے۔

۲۔ جو غریب پوست پی کر لیٹے رہنے کے عادی تھے، تیرے نغموں نے ان میں بلند ولولوں کی لذت پیدا کر دی ہے۔

۳۔ جن پرندوں کے پر ٹوٹے ہوئے تھے اور وہ گھر کے صحن میں اپنی اس حالتِ زار پر خوش و خرم بیٹھے تھے، تو نے ان میں وہ جوش پیدا کر دیا کہ اب آسمان کی نیلی فضاؤں میں اڑنے کے لیے تڑپ رہے ہیں۔

۴۔ تیرے اس گناہ کی سزا یہ ہے کہ تجھے صبح کے نغموں سے محروم کر دیا جائے۔ نیز تجھ سے عشق، مستی اور دیدار کا بلند رتبہ چھین لیا جائے۔

جو قوم پستی میں گری ہوئی ہو، اس میں سربلندی کا جذبہ پیدا کرنا صرف انھیں لوگوں کے نزدیک گناہ ہو سکتا ہے جو دشمن ہوں۔ اقبال کا مقصد یہ ہے کہ میں نے قوم کے لیے عزت مندانہ حیات کا جو سرمایہ فراہم کیا، دشمن اسے اچھی نظروں سے نہیں دیکھ سکتے۔ ان کا بس چلے تو مجھ سے وہ جوہر چھین لیں، جن کی بدولت میں نے اپنی قوم میں زندگی کی نئی روح پھونکی۔

اسلام اور مسلمان

صبح

اقبال نے خود فرمایا ہے کہ یہ دو شعر شیش محل بھوپال میں لکھے گئے
جہاں وہ نواب صاحب بھوپال کے مہمان کی حیثیت میں بغرض علاج ٹھہرے ہوئے تھے۔

۱۔ ایک صبح وہ ہے جس سے آنے والی کل اور آج پیدا ہوتے ہیں۔ معلوم نہیں، یہ صبح جو کبھی آج کی شکل اختیار کرتی ہے اور کبھی آنے والی کل کی، کہاں سے پیدا ہوتی ہے۔

۲۔ وہ صبح جس سے وجود کا شبستان لرزتا ہے، جس سے زندگی کے اندھیرے میں اُجالا ہوتا ہے، ایمان والے بندے کی اذان سے پیدا ہوتی ہے۔

مراد یہ ہے کہ ایک صبح اس کائنات کی ہے، جسے عُرفِ عام میں صبح کہتے ہیں اور وہ سورج کے طلوع سے نمودار ہوتی ہے، اگرچہ اس کی اصلیت کے متعلق کسی کو صحیح علم نہیں۔ یہی صبح کائنات کے اندھیرے کو زائل کر کے ہر جگہ روشنی پھیلاتی ہے۔ دوسری صبح وہ ہے جس سے انسانی زندگی کے اندھیرے میں اُجالا ہوتا ہے۔ اس صبح کا سرچشمہ مومن کی اذان ہے۔ یعنی جب مومن کی زبان سے کلمۂ حق بلند ہوتا ہے تو یہ صبح نمودار ہو جاتی ہے۔ افراد و اقوام میں اسی صبح زندگی کی تازہ روح دوڑ جاتی ہے جس طرح ہر صبح کائنات کائنات میں ایک حرکت عام پیدا کر دیتی ہے۔

لآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

فسان: اوزار تیز کرنے کا پتھر۔ سان **متاعِ غرور:** دھوکے کی ٹٹی۔ اشارہ ہے قرآن مجید کی آیت کے اس ٹکڑے کی طرف وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ — اور نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر نری دھوکے کی ٹٹی۔

۱۔ لا اِلٰہ اِلّا اللہ یعنی کلمۂ توحید خودی کا چھپا ہوا بھید ہے۔ اگر خودی کو تلوار قرار دیا جائے تو اس کی سان لا الٰہ الا اللہ ہے، جس پر یہ تلوار تیز کی جاتی ہے۔ یعنی توحید خالص کے بغیر خودی کی تلوار کچھ کام نہیں دے سکتی۔

۲۔ یہ دنیا ایک بُت خانہ ہے۔ اس بت خانے میں توحید کی صدا بلند کرنی چاہیے اور یہاں لا الٰہ الا اللہ کا نعرہ لگانا چاہیے۔ یہ نعرہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے نقشِ قدم پر چلنے والا مردِ حق ہی لگا سکتا ہے۔ اس مسلک کے پابند ہر دور اور ہر زمانے میں پیدا ہوتے رہے ہے۔ موجودہ زمانہ بھی اپنے ابراہیم ہی کی تلاش میں ہے تاکہ توحید کا نعرہ لگے اور دنیا کا بُت خانہ کعبے کی طرح بتوں سے پاک ہو جائے۔ بتوں سے مراد وہ تمام افکار، عقاید، اعمال اور اخلاق ہیں جو دینِ حق کے خلاف ہیں

۳۔ اے مخاطب! تو نے اپنا دل دنیا میں لگا لیا۔ تو نے وہ سودا کر لیا، جو سراسر دھوکے کی ٹٹی ہے۔ تو نفع نقصان کے فریب میں مبتلا ہو گیا۔ غافل! اس فریب کا طلسم توڑ۔ اس چکّر سے باہر آ۔ اور لا الٰہ الا اللہ کا نعرہ لگا۔

۴۔ یہ دنیا کا مال وغیرہ، یہ رشتہ دار، قریبی، دوست اور عزیز، یہ سب ایسے بُت ہیں جو وہم و گمان نے تراشے ہیں۔ ان کی کچھ حقیقت نہیں۔ مستقل اور پائدار حقیقت صرف لا الٰہ الا اللہ ہے۔

مطلب یہ کہ مال، رشتے، دوستیاں، عزیز داریاں راہِ حق میں تیرے لیے زنجیرِ پا نہ بننی چاہئیں۔ وہم و گمان کے ان بتوں کو توڑ ڈال۔

۵۔ عقل نے اپنے دوش پر زمان و مکان کا زُنّار پہن رکھا ہے۔ حقیقتِ حال پر نظر رکھی جائے تو نہ زمان کی کوئی اصل ہے، نہ مکان کی۔ اصل صرف لا الٰہ الا اللہ ہے۔

۶۔ نغمے موسمِ بہار میں گائے جاتے ہیں لیکن لا الٰہ الا اللہ وہ نغمہ ہے جو گلاب اور لالے کے موسم یعنی فصلِ گل کا پابند نہیں۔ بہار اور خزاں اس کے لیے یکساں ہیں۔

مراد یہ ہے کہ اوّل صدائے توحید ہر فضا میں بلند ہونی چاہیے۔ دوم قوم کو عروج و عظمت کا مقام حاصل ہو یا وہ پستی میں گری ہوئی ہو، دونوں صورتوں میں توحید کی اشاعت اس کا پہلا اور آخری فرض ہے۔

۷۔ قوم کے افراد نے اپنی آستینوں میں بُت چھپا رکھے ہیں۔ مثلاً: غیر اسلامی تمدن و معاشرت، رنگ، نسل، وطن اور بیسیوں غیر اسلامی عقاید و مراسم کے بُت تراش رکھے ہیں جو سراسر اسلام کی ضد ہیں۔ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لا الٰہ

الا اللہ کی بے پناہ ضرب سے ان تمام بتوں کو توڑ کر رکھ دوں اور قوم میں اسلامیت کی سچی روح اور سچی شیفتگی پیدا کر دوں۔ اس کا اصل ذریعہ پیغامِ توحید ہی ہے۔

تن بہ تقدیر

۱۔ جس قرآن کی برکت سے مسلمانوں کو وہ مقامِ بلند نصیب ہوا تھا، گویا چاند اور تارے بھی ان کے فرماں بردار بنا دیے گئے تھے۔ اسی قرآنِ پاک کو اب دنیا ترک کر دینے کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ بنایا جا رہا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ قرآنِ حکیم نے مسلمانوں کو ایمان کی پختگی عطا کر کے خوفِ خدا، پاکیزگی سیرت، موت سے بے پروائی، کفر و شرک کی بیخ کنی، بہادری اور جہاد کا حکم دیا۔ ان حکموں پر عمل کی برکت سے وہ بے مثال قوت کے حامل بن گئے لیکن افسوس ہے کہ عہدِ حاضر میں مسلمانوں نے قرآنی تعلیم کو بالکل فراموش کر کے ترکِ دنیا کا غیر اسلامی طریق اختیار کر لیا اور دعویٰ یہ کیا کہ قرآن ہی ترکِ دنیا کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ قرآنِ حکیم نے حضرت عیسیٰؑ اور انجیل کی تعلیم مہر و محبت کا ذکر کرتے ہوئے واضح طور پر فرمایا: وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا —— (حدید) عیسائیوں نے رہبانیت خود گھڑ لی۔ حضرت عیسیٰؑ نے ایسی کوئی تعلیم نہ دی تھی، لہٰذا ترکِ دنیا قرآن کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔

۲۔ جن مسلمانوں کے ارادوں میں خدا کی تقدیر اور مرضی چھپی ہوئی تھی، آج ان کا طریق عمل یہ ہے کہ تقدیر پر بھروسا کیے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ جب مسلمان احکامِ الٰہی کی پوری طرح تعمیل کرتے تھے تو خدا بھی ان کی مدد کرتا تھا اور وہ راہِ حق میں جو بھی قدم اٹھاتے تھے، اللہ کی تائید سے وہ فتح و کامرانی کی منزلِ مقصود میں پڑتا تھا، لیکن آج انھوں نے خدائی فرمان کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ اور نیک کام کرنے چھوڑ دیے۔ ساتھ ہی تقدیر کے بالکل غلط معنی سمجھ لیے۔

۳۔ جو بُری باتیں تھیں وہ آہستہ آہستہ اچھی بن گئیں، کیونکہ غلامی میں قوموں کا ضمیر بدل جاتا ہے۔

حاصل یہ کہ جب کوئی قوم کسی کی محکوم اور غلام بن جاتی ہے تو اس کے نزدیک اچھائی اور بُرائی کا معیار بھی بدل جاتا ہے، یعنی وہ اچھائی کو برائی اور برائی کو اچھائی سمجھنے لگتی ہے۔ یہی حالت مسلمانوں کی ہے۔ انھوں نے جن مسئلوں کے متعلق ٹھوکریں کھائیں، ان میں ایک مسئلہ تقدیر کا بھی ہے۔

معراج

دُرّاج: تیتر **وَالنَّجْم**: قرآن مجید کی سورۃ والنّجم کے ابتدائی الفاظ جن میں واقعۂ معراج کی کیفیت بتائی گئی ہے۔ متعلقہ آیات یہ ہیں:

مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی۔ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰی مَا یَرٰی۔ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰی۔ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰی۔ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰی۔ اِذْ یَغْشَی السِّدْرَةَ مَا یَغْشٰی۔ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی۔ لَقَدْ رَاٰی مِنْ اٰیٰتِ رَبِّهِ الْکُبْرٰی۔

جھوٹ نہیں کہا رسول کے دل نے جو دیکھا۔ اب کیا تم اس سے جھگڑتے ہو۔ اس پر جو اس نے دیکھا اور اس کو اس نے دیکھا ہے اترتے ہوئے ایک بار اور بھی سدرۃ المنتہٰی کے پاس؟ اس کے پاس ہے بہشت آرام سے رہنے کی۔ جب چھا رہا تھا سدرۃ پر جو کچھ چھا رہا تھا۔ بہکی نہیں نگاہ اور نہ حد سے بڑھی۔ بے شک دیکھیں اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں۔

۱۔ وہ ذرّہ جسے عشق کا جذبہ وجوش اڑان کی لذّت بخش دے، چاند اور سورج کو مسخّر کر سکتا ہے۔

اشارہ ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعۂ معراج کی طرف۔

۲۔ اے باغ کے ساتھیو! باز کے معرکے میں کامیابی حاصل کر لینا کچھ مشکل نہیں۔ شرط یہ ہے کہ تیتر کے سینے میں جو سانس ہے وہ سوزِ عشق سے معمور ہو۔ یعنی عشقِ حق موجود ہو تو کمزور بھی قوت والوں پر غالب آ سکتے ہیں۔ کم من فئة قلیلة غلبت فئة کثیرة کا مطلب یہی ہے۔

۳۔ مسلمان تیر ہے، جس کا نشانہ ثریّا ہے۔ یعنی یہ تیر ان بلند ستاروں کو نشانہ کیے بغیر نہیں رہتا، جنھیں سات سہیلیاں کہتے ہیں۔ معراج کا یہ نکتہ جان کی خلوت گاہ کا بھید ہے۔

مقصود یہ ہے کہ معراج کا جو نکتہ ذہن میں آتا ہے اور جسے اصل نکتہ سمجھنا چاہیے، یہ ہے کہ مسلمان کی بلند ہمتی کے سامنے ثریّا کی بلندی کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معراج نے عالمِ انسانیت

کے لیے عظمت کی آخری راہ کھول دی۔

۴۔ اگر تو سورۂ نجم کو جس کا آغاز والنّجم سے ہوتا ہے، نہ سمجھ سکا تو اس پر تعجّب نہ ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ تیرا مد و جزر ابھی تک چاند کا محتاج چلا آتا ہے۔ تو نے عشقِ حق سے بہرہ نہ پایا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم سے فائدہ نہ اٹھایا۔ مادی اسباب کا محتاج رہا۔ نتیجہ وہی ہو سکتا تھا۔

ایک فلسفہ زدہ سیّد زادے کے نام

اس نظم میں جس سید زادے سے خطاب ہے وہ ۱۹۵۹ء میں اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ انھیں فلسفہ زدہ سمجھنا تو غالباً مناسب نہ ہو، لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک مرتبہ وہ اقبال کی خدمت میں گئے تو فلسفہ زدوں ہی کا سا طریق گفتگو اختیار کر لیا۔ اقبال ان دنوں بیمار تھے اور سن کے احساسات اور بھی نازک ہو گئے تھے۔ اس کا اثر ان پر بہت زیادہ ہوا۔ جوابات میں معترض کی تسلّی تو کر دی۔ لیکن دل پر یہ اثر برابر قائم رہا کہ نہیں معلوم کتنے ہی پڑھے لکھے جوان ایسے ہی آزادانہ خیالات سے متاثر ہیں۔ اسی قسم کے تاثرات نے نظم کی شکل اختیار کی۔ اس میں اصل مخاطب وہی صاحب نہیں جنھوں نے فلسفیانہ انداز میں گفتگو کی تھی بلکہ ایسے خیالات کے تمام اصحاب مخاطب ہیں۔ گویا واقعہ اگرچہ خاص ہے مگر خطاب عام ہے۔

برگساں: فرانس کا مشہور فلاسفر جس سے اقبال نے ملاقات بھی کی تھی۔ **ہیگل:** جرمنی کا مشہور فلاسفر جس کا فلسفہ ایک وقت میں انسانی فکر و نظر کا بہت بڑا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ **اشراق:** لفظی معنی روشنی دینا، چمکنا۔ مراد ہے طلوعِ آفتاب کے بعد کا وقت جسے ہمارے ہاں چاشت کہتے ہیں۔ **لاتی و مناتی:** لات اور منات سے منسوب۔ جو عرب کے دو مشہور بُت تھے۔ لات طائف کے قبیلۂ ثقیف کا بُت تھا اور منات قبیلۂ خزاعہ کا۔ لاتی و مناتی سے مراد ہیں بُت پرست۔ **تقویم:** مضبوطی۔ استحکام۔ **پورِ علیؓ:** حضرت علی رضی اللہ عنہ کے فرزند یعنی نسباً سید۔ **بُوعلی:** مشہور فلسفی اور حکیم بوعلی سینا۔ **قرشی:** قریش سے منسوب یعنی عرب۔

۱۔ اگر تو اپنی خودی ضایع نہ کر بیٹھتا اور اپنی حقیقی حیثیت قائم رکھتا تو برگساں کو اپنا رہنما کیوں بناتا؟ زنّار باندھ کر اس کے بُت خانے میں کیوں جاتا؟

۲۔ ہیگل کے پاس جو سیپی ہے، وہ موتی سے خالی ہے اور اس نے جو طلسم تیار کیا ہے وہ سراسر خیالی ہے۔
مراد یہ ہے کہ برگساں اور ہیگل اگرچہ بہت بڑے فلاسفر مانے جاتے ہیں، لیکن جو کچھ وہ انسانیت کے لیے چھوڑ گئے سراسر بے سود ہے۔ اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ انھوں نے انسانیت کے اصل مسائل کے متعلق کوئی رہنمائی ہی نہیں کی، لہٰذا ان کی کتابیں پڑھنے سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے؟

۳۔ انسانیت کے لیے جو مسئلے توجہ کے مستحق ہیں، وہ یہ ہیں کہ زندگی میں استحکام پیدا کرنے کی کیا صورت ہے؟ خودی کو زمانے کی قید سے نجات دلا کر لازمانی کیونکر بنایا جا سکتا ہے؟

۴۔ انسان کو اس شے کی تلاش ہے، جس سے انسانیت کو ثبات اور پائداری نصیب ہو۔ اسے دنیا میں صحیح اور احسن طریق پر زندگی بسر کرنے کا نظام درکار ہے۔ سوچ کہ کیا ان مسائل کا کوئی اطمینان بخش جواب برگساں اور ہیگل کی کتابوں میں مل سکتا ہے؟ جب وہ لوگ انسانوں کی حقیقی طلب ہی سے واقف نہیں تو انھیں راستہ کیا دکھا سکتے ہیں؟

۵۔ اے مخاطب! جس شے سے اس کائنات کے اندھیرے میں اجالا ہو سکتا ہے، جو اس کے وقت عشا کو وقتِ چاشت میں بدل سکتی ہے، وہ برگساں اور ہیگل کا فلسفہ نہیں بلکہ مومن کی اذان ہے، جس سے آفاق گونج اٹھے۔ وہ خدا کی کبریائی کا اعلان اور اس کی توحید کا پیغام ہے۔

۶۔ اب اقبال اپنا اور سیّد زادے کا مقابلہ کرتے ہیں تاکہ اپنا حقیقی مدعا خوبی ذہن نشین کر سکیں۔ فرماتے ہیں کہ میری اصل و نسل سومناتی ہے اور میرے باپ دادا سب کے سب بت پرست تھے۔

۷۔ تو ہاشمی سیّد کی اولاد ہے۔ سیّد زادہ ہے۔ میرا جسم جس گھرانے میں پیدا ہوا، وہ برہمنوں کا گھرانہ تھا۔

۸۔ فلسفہ میری آب و گل میں شامل ہے اور میرے دل کی رگ رگ میں سمایا ہوا ہے۔

۹۔ اقبال کو کتنا ہی بے ہنر سمجھ لیا جائے لیکن وہ فلسفے کی نس نس سے واقف ہے۔

۱۰۔ تیرے جنونِ عشق کے شعلے میں کوئی تپش اور کوئی سوز موجود نہیں، گویا اسے شعلہ کہنا ہی درست نہ ہوگا۔ آ میں تجھے دل کو روشن کرنے والا نکتہ بتاتا ہوں۔

۱۱۔ عقل کا انجام یہ ہے کہ وہ خدا کے حضور سے محروم ہو جائے۔ اور فلسفہ انسان کو زندگی کی حقیقتوں سے دور پھینک دیتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ جو لوگ عقل کے چکروں میں پڑ جائیں انھیں ایمان اور یقین کی دولت نصیب نہیں ہوتی اور فلسفی
ان بحثوں میں لگے رہتے ہیں جنھیں زندگی کی حقیقتوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

۱۲۔ خیالات کے بے آواز نغمے عمل کی لذّت کے لیے موت کا پیغام ہیں، یعنی فلسفہ بجائے خود کسی کے لیے کتنا ہی دلکش ہو، لیکن اسے فکر کے بے آواز نغموں کے سوا کیا سمجھا جا سکتا ہے؟ اور جب انسان ان نغموں کی رنگینی میں مگن ہو جائے تو اس سے ہمّت، جواں مردی اور اولوالعزمی کے کسی کارنامے کی امید نہ رکھنی چاہیے۔ فکر میں غرق رہنے سے عمل کی قوت مر جاتی ہے۔

۱۳۔ فلسفے کی حقیقت معلوم کر لی۔ اب دین پر نظر ڈال۔ یہ زندگی بسر کرنے کا دستور العمل ہے۔ اس کی برکت سے انسان کا قدم زندگی کے راستے پر استوار ہو جاتا ہے۔ دین حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیمؑ کا بھید ہے۔ دین ان مقدس و جلیل القدر ہستیوں کی بتائی ہوئی راہِ عمل ہے۔

۱۴۔ یہ اور اگلا شعر فارسی کے مشہور شاعر حکیم خاقانی کی مثنوی "تحفۃ العراقین" سے ماخوذ ہیں۔ حکیم خاقانی کہتا ہے کہ تمام دوسرے سہارے چھوڑ کر دل کو حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے وابستہ کر دینا چاہیے انھیں ارشادات کی پیروی میں لگے رہنا چاہیے۔ اسے حضرت علیؓ کی اولاد! بوعلی جیسے فلسفیوں کے پیچھے نہ چلنا چاہیے۔
پورِ علیؓ اور بوعلیؓ میں ایک خوبی یہ ہے کہ پورِ علیؓ کے معنی علیؓ کا بیٹا اور بوعلیؓ کے معنی علی کا باپ ہیں۔

۱۵۔ جب تجھے راستہ دیکھنے والی آنکھ میسّر نہیں تو بخاری کے بجائے قرشی کو اپنا راہنما بنا لینا ہی اچھا ہے۔
یہاں قرشی سے مُراد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جنھیں خدا کی رحمت سے راستہ دیکھنے اور دکھانے والی آنکھ عطا ہوئی۔ بخاری سے مراد بوعلی سینا ہے، جس کا اصل وطن بخارا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم روئے زمین پر خدا کا بھیجا ہوا ابدی نُور ہیں۔ بوعلی سینا اور ایسے دوسرے فلسفیوں کے ہاں عقلی پریشانیوں کی تاریکی کے سوا کیا ہے؟

زمین و آسمان

اس نظم میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ مختلف انسانوں کے خاص حالات کی بنا پر ان کے نقطۂ نگاہ بھی بدلتے رہتے ہیں۔

۱۔ تو جسے بہار کا موسم سمجھتا ہے ممکن ہے دوسروں کی نگاہ میں خزاں کا موسم ہو۔

یہ دنیا کی بہت بڑی حقیقت ہے۔ ایک کا عروج دوسرے کی پستی ہے۔ ایک کی حکمرانی دوسرے کی محکومی اور یہ تو سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ آدھی دنیا کا دن باقی آدھی دنیا کی رات ہے۔

۲۔ حالات ہر لحظہ بدلتے رہتے ہیں، لہٰذا اے راستہ چلنے والے مسافر! تجھے نفع نقصان کے جھنجھٹ میں مبتلا نہ ہونا چاہیے۔

۳۔ تو جسے اپنی دنیا کا آسمان قرار دیتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کسی دوسری دنیا کی زمین ہو۔ گویا حالات کے بدل جانے سے نقطۂ نگاہ میں ایسا وسیع تغیر پیدا ہو سکتا ہے کہ آسمان زمین بن جائے۔

مسلمان کا زوال!

اس نظم میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ مسلمان کے زوال کا اصل سبب بے زری نہیں بلکہ فقر سے محرومی ہے۔

قاضی الحاجات: حاجتیں پوری کرنے والا۔ **تونگری:** دولت مندی۔ **جسور:** جرأت و جسارت والے۔ دلیر۔

۱۔ اس میں شبہ نہیں کہ دولت بھی ایک حد تک دنیا میں حاجتیں پوری کرتی ہے، لیکن فقر اور درویشی کی برکت سے جو کارنامے انجام دیے جا سکتے ہیں، وہ مال و زر کی بنا پر انجام نہیں دیے جا سکتے۔

۲۔ میری قوم کے جوانوں میں جواں مردی اور غیرت پیدا ہو جائے تو میری درویشی اور خدامستی بھی سکندر کی شانِ فتح و ظفر سے کم نہیں۔

۳۔ مومن کے زوال کا سبب بے زری اور ناداری نہیں بلکہ کچھ اور ہے اور تُو خود بھی اسے سمجھتا ہے۔ وہ سبب

کیا ہے ؛ یہ ہے کہ مسلمانوں میں دلیری، جواں مردی اور غیرت باقی نہیں رہی، جیسا کہ اس سے پہلے شعر میں بیان کیا گیا۔

۴۔ پھر اپنی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ میرا جو ہر دنیا میں نمایاں ہوا اور مجھے عزّت و احترام کا بلند مقام ملا تو اس کا سبب یہ نہیں کہ میرے پاس دولت زیادہ تھی۔ میں تو حقیقی معنی میں بے زر تھا۔ یہ سب کچھ مجھے درویشی اور خدا مستی کی بدولت حاصل ہوا۔

علم و عشق

تخمین وظن: وہم و گمان

فتح باب: لفظی معنی دروازہ کھولنا۔ مراد ہے کامیابی اور مقصد کا حصول۔ **ابنُ الکتاب:** لفظی معنی کتاب کا بیٹا۔ مراد ہے کتابوں پر انحصار رکھنے والا۔ **اُمُّ الکتاب:** لفظی معنی کتاب کی ماں یا اصل و بنیاد۔ سورۂ زخرف میں اس سے لوحِ محفوظ مراد لی گئی ہے۔ شاہ عبد القادرؒ نے وہاں اُمُّ الکتاب کا ترجمہ کیا ہے بڑی کتاب۔ عربی زبان میں ام کا لفظ ان چیزوں پر بھی بولا جاتا ہے جن میں جامعیّت ہو اور ان پر بھی جو اپنی قسم کی چیزوں میں نمایاں اور ممتاز ہوں۔ اسی وجہ سے سورۂ فاتحہ کو اُمُّ القرآن کہا گیا کہ یہ قرآن کے اہم مطالب کی جامع اور مرکز ہے۔ اقبال نے تیسرے لیکچر میں امّ الکتاب کو علمِ الٰہی وقت کا مترادف قرار دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو لیکچروں کا پہلا ایڈیشن صفحہ ۱۰۵۔)

پہلا بند: علم نے مجھ سے کہا کہ عشق تو دیوانگی ہے۔ عشق نے کہا کہ علم کی ہر چیز وہم و گمان پر مبنی ہے۔ اسے وہم و گمان کے غلام! تو کتاب کا کیڑا نہ بن۔ عشق سراپا حضوری یا جلوۂ حق ہے اور علم سراپا پردہ۔

یہاں علم سے مراد حقیقی علم نہیں یعنی علمِ دین بلکہ فلسفہ اور اس قسم کے دوسرے علوم مقصود ہیں، جن میں مشغول رہنے سے انسان حقیقت تک نہیں پہنچ سکتا بلکہ اس کی آنکھوں پر پردے پڑتے جاتے ہیں اور وہ مقصود سے دور ہوتا جاتا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ "علم نے مجھ سے کہا" اور "عشق نے مجھ سے کہا" کا مطلب یہ نہیں کہ یہ دونوں چیزیں الگ الگ اقبال سے مخاطب ہوئیں۔ مدّعا یہ ہے کہ اہلِ فلسفہ عشقِ حق کو دیوانگی سمجھتے ہیں اور اہلِ عشق فلسفیانہ علوم کو وہم و گمان قرار دیتے ہیں۔

دوسرا بند: کائنات کے معرکے میں جو گرم بازاری اور چہل پہل نظر آتی ہے، وہ سب عشق کی برکت ہے۔ علم سے صفات کے متعلق معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ عشق کی بدولت ذاتِ باری تعالیٰ کا دیدار نصیب ہوتا ہے۔

زندگی میں سکون اور ثبات عشق ہی کے دم سے ہے۔ جینا اور مرنا بھی عشق ہی سے ہے۔ یعنی انسان کو تسکین اور پائداری صرف عشقِ حقیقی کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ جینے سے مراد ہے خدا کے حکموں کی پیروی میں جینا، مرنے سے مراد ہے راہِ حق میں مرنا۔ علم کھلا ہوا سوال ہے یعنی اس سے کوئی پیاس بجھ نہیں سکتی اور اس کے ذریعے سے انسان قطعی منزل پر نہیں پہنچتا۔ عشق ہر فطری طلب کے لیے تسکین کا سامان ہے۔

تیسرا بند: بادشاہی، درویشی اور دین سب عشق کے معجزے ہیں۔ بڑے بڑے تاجدار عشق کے ادنیٰ غلام ہیں۔ عشق ہی مکان ہے۔ عشق ہی مکین یعنی اس میں رہنے والا ہے۔ عشق ہی زمانہ ہے اور عشق ہی زمین ہے۔ عشق سراپا یقین ہے اور یقین تمام بند دروازوں کو کھولنے کی کنجی ہے۔ اسی سے حقیقی مقصد و مدّعا حاصل ہوتا ہے۔

چوتھا بند: عشق و محبت کے آئین میں کہیں ٹھہرنے کا لطف حاصل کرنا حرام ہے۔ اس آئین کے مطابق طوفانوں کے ہنگامے میں زندگی بسر کرنا عین مراد ہے، لیکن ساحل پر بیٹھنے کی لذّت سراسر منع ہے۔ عشق ہر لحظہ بجلی ہی گرنے کا آرزومند رہتا ہے اور یہی اس کے لیے زیبا ہے۔ پیداوار اور حاصل اس کے لیے حرام ہے۔ علم کا انحصار ہر چیز کے لیے کتابوں پر ہے۔ وہ کتابوں کے بغیر ایک بھی قدم آگے نہیں بڑھ سکتا۔ عشق خود امّ الکتاب اور لوحِ محفوظ ہے، جہاں سے الٰہی علوم کے تمام چشمے جاری ہوئے۔

اجتہاد

اس نظم میں اس اجتہاد کی حقیقت بتائی گئی ہے جو مسلمانوں نے محکومی کے زمانے میں اختیار کیا۔

عمیق: گہرا

۱۔ ہندوستان میں دینی علوم بہت پڑھائے جاتے ہیں، لیکن دین کی حکمت کہاں سے سیکھی جائے؟ شریعت کے اسرار و نکات کس ذریعے سے معلوم ہوں؟ نہ علما میں عمل کی کوئی لذّت نظر آتی ہے، نہ ان کی فکر و نظر میں گہرائی ہے۔

مراد یہ ہے کہ حکمتِ دین سیکھنے کے دو ہی ذریعے ہیں: یا تو وہ حکمت اہلِ علم کے عمل میں نمایاں ہو یا وہ حقائقِ شریعت پر غور و فکر کے عادی ہوں۔ جب یہ دونوں باتیں ناپید ہیں تو دین کی حکمت سیکھنے کا شوق کہاں سے پورا کیا جائے؟

۲۔ حلقۂ شوق میں بیٹھنے والے یعنی اہلِ تصوّف ایک زمانے میں جرأت و ہمّت سے کام لے کر حکمتیں واضح کرتے رہتے تھے۔ اب ان میں غور و فکر کی ہمّت ہی نہیں رہی۔ افسوس کہ محکومی اور غلامی کا دور آیا تو اندھی تقلید عام ہو گئی اور تحقیق کا جوہر باقی نہ رہا۔

۳۔ علمائے دین کی حالت دیکھو، وہ اس درجہ بے توفیق ہو چکے ہیں کہ اپنی حالت بدلنے پر مائل نہیں ہوتے۔ قرآن کو بدل دینے کی کوششوں میں لگے رہتے ہیں۔

۴۔ ان غلاموں کے طور طریقے دیکھے جائیں تو دل پر یہ اثر پڑتا ہے، گویا ان کے نزدیک قرآنِ حکیم، پناہ بخدا، اس وجہ سے ناقص و ناتمام ہو گیا کہ اس نے مسلمانوں کو غلامی کے طریقے نہ سکھائے۔ حالانکہ قرآنِ حکیم غلامی و محکومی نہیں، صرف حکمرانی اور فرماں روائی سکھانے کے لیے آیا تھا۔ ان لوگوں میں اپنی حالت بدلنے کی توفیق ہوتی تو غلامی سے نکل کر حکمرانی کے طور طریقے اختیار کرتے۔ اُنھوں نے قرآن سے محکومی اور غلامی کے لیے جواز کی سندیں ڈھونڈ نکالیں اور اس کی حقیقت ہی بدل ڈالی۔

شکر و شکایت

لاہوت: رُوحانی مراتب کا وہ عالم جہاں پہنچ کر سالک کو فنا فی اللہ کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ عالمِ بالا۔

۱۔ اے باری تعالیٰ! اگرچہ میں ایک بے سمجھ بندہ ہوں، لیکن تیرا شکر ادا کرتا ہوں کہ تو نے مجھے اپنے فضل و کرم سے عالمِ بالا کے اُس چھپے ہوئے پاکیزہ جہان کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے، جہاں تیری ذات کے سوا اور کوئی نہیں۔

۲۔ تیرے اسی لطف و احسان کی بدولت میں اس قابل ہو گیا ہوں کہ میں نے لاہور سے بخارا اور سمرقند کی سرزمین تک مسلمانوں کے دلوں میں زندگی کا ایک تازہ ولولہ اور جوش پیدا کر دیا ہے۔

۳۔ یہ میرے نغموں ہی کا اثر ہے کہ خزاں کے موسم میں صُبح کے وقت گانے والے پرندے میری صحبت میں خوش و خرّم رہتے ہیں۔

خزاں کے موسم میں پرندوں کو عموماً گانے میں مزہ نہیں آتا۔ اقبال کہتے ہے کہ اگرچہ مسلمانوں پر زوال کی حالت

طاری ہے، یعنی ان کی زندگی کے چمن زاروں پر خزاں چھائی ہوئی ہے، لیکن اس دور میں بھی میری قوم کے دردمند لوگ میرے شعر ذوق و شوق سے پڑھتے اور ان سے مستفید ہوتے ہیں۔ اس لیے کہ ان میں انھیں بہار کا مزہ آ جاتا ہے۔ یہ دراصل اپنے کلام کی حقیقی حیثیت کا اظہار بڑے ہی دل کش اور پُر تاثیر انداز و اسلوب میں کیا ہے۔

۴۔ لیکن اے باری تعالیٰ! کیا میرے لیے یہ انتہائی دکھ کی بات نہیں کہ اعلیٰ درجے کے حیات بخش جوہر عطا فرمانے کے بعد مجھے ایک ایسے ملک میں پیدا کر دیا، جہاں کے باشندے غلامی پر راضی ہیں؟

اس نظم کا اصل مقصود آخری مصرع ہے۔ یعنی اقبالؔ مسلمانوں کو یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ غلامی پر رضامند ہو جانا کسی بھی قوم کے لیے باعثِ عزت نہیں۔ مسلمان تو اپنے دل کو ایسے تصور سے بھی آلودہ نہیں کر سکتا۔ اس مفہوم کو انتہائی پُر تاثیر بنانے کے لیے یہ اسلوبِ بیان اختیار کیا گیا جو صرف بارگاہِ حق سے فیض یافتہ شاعر ہی اختیار کر سکتا ہے۔ واضح رہے کہ یہ نہیں کہا، ملک کے باشندے غلامی میں مبتلا ہو گئے۔ کہ یہ ایک اتفاقی حادثہ ہے جو ہر قوم کو پیش آ سکتا ہے۔ فرمایا:

غلامی پر راضی ہو گئے۔ یعنی صرف ظاہری حالت ہی ناسازگار نہیں بلکہ ان کے دلوں میں آزادی کے لیے تڑپ ہی باقی نہیں رہی۔ گویا کارواں کے دل سے احساسِ زیاں مٹ گیا۔ یہ حالت فرد یا قوم کی زندگی میں دل اور روح کی موت ہے۔

ذکر و فکر

اس مختصر سی نظم میں اقبالؔ نے انسانی کمالات کے مختلف پہلو ذکر اور فکر کے نقطۂ نگاہ سے پیش کیے ہیں۔

عَلَّمَ الْاَسْمَاءَ: اشارہ ہے قرآن مجید کی اس آیت کی طرف — وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ .... الخ یعنی سکھا دیے اللہ نے آدمؑ کو نام تمام چیزوں کے .... الخ اس سے بعض اصحاب نے محض نام مراد لیے۔ بعض نے ان کا مطلب یہ سمجھا کہ آدم علیہ السلام کو اشیا کے حقایق و خواص کا علم دے دیا گیا۔ بہرحال انسان کی معنوی تکمیل کا وہ عظیم الشان واقعہ ہے، جس کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات قرار پایا۔

مقالات: مقالہ کی جمع یعنی کہی ہوئی بات۔ مراد ہے کلام یا مجموعۂ اقوال یا تصانیف سے۔

سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی: پاک ہے میرا پروردگار جو سب سے اوپر ہے۔ یہ دعا سجدے میں پڑھی جاتی ہے اور سورۂ اعلیٰ کی پہلی آیت سے ماخوذ ہے: سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰی۔ (پاکی بیان کر اپنے پروردگار کی جو سب سے اوپر ہے۔)

۱۔ ذکر اور فکر ایک ہی مسافر کی جستجو اور تلاش کے مختلف مقام ہیں۔ کون مسافر؟ وہ جس کی شان میں عَلَّمَ الْاَسْمَآءَ کی آیت نازل ہوئی، یعنی انسان۔

۲۔ ذکر کے مقام اور مرتبے کا عملی نقشہ دیکھنا چاہو تو مولانا رُومؒ اور خواجہ فریدالدین عطّارؒ کو دیکھ لو۔ انھوں نے ذکر میں درجۂ کمال حاصل کیا۔ فکر کی بلندی کا نقشہ تمھیں مشہور حکیم بوعلی سینا کی تصانیف میں مل سکتا ہے۔

۳۔ فکر کا کمال یہ ہے کہ وہ زمان و مکان کو ناپنا۔ یعنی ان کی حقیقت معلوم کرنے میں لگی رہے۔ ذکر کا کمال یہ ہے کہ انسان سر سے پاؤں تک اپنے پروردگار کی پاکیزگی کا بیان بن جائے یعنی سُبْحَانَ رَبِّیَ الْاَعْلٰی کا اس سے بہتر نقشہ کہیں نہ مل سکے۔

مُراد یہ ہے کہ حقیقت مادیات کی تلاش میں سرگرم رہے اور ذکر کا تعلّق صرف ذاتِ باری تعالیٰ سے ہوتا ہے۔ صاحبِ ذکر اس ذاتِ پاک کے سوا ہر شے سے اپنا تعلّق توڑ لیتا ہے یا تعلقات کو پروردگار کی ذات کے تابع کر دیتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں فکر وہی شے ہے جسے اقبال کہیں کہیں علم قرار دیتے ہیں اور ذکر کے لیے انھوں نے عشق کی اصطلاح اختیار کی۔

مُلّائے حرم

۱۔ مُلّا سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: اگر خدا تک آپ کی رسائی ہے تو میرے لیے اس پر تعجّب کی کوئی وجہ نہیں۔ ہو سکتا ہے، یہ درست ہو، لیکن ایک حقیقت سے میں یقینی طور پر واقف ہوں اور وہ یہ ہے کہ حضرت! آپ کی نگاہوں سے انسان کا مرتبہ اور مقام پوشیدہ ہے۔

اس شعر کے پہلے مصرع میں خدا تک رسائی کے متعلق جو کچھ فرمایا گیا، وہ حقیقت میں طنز ہے۔ جس شخص کو آدمی کے مرتبے کا اندازہ نہیں وہ خدا تک کیا پہنچے گا؟ طنز کے طور پر فرماتے ہیں کہ مُلّا اگر خدا تک پہنچنے کا دعویدار ہے تو اسے جھٹلانا بالکل فضول ہے، اس لیے کہ نتیجہ کچھ نہ نکلے گا۔ پھر کیوں نہ اس دعوے کو چھوڑ کر وہ حقیقت بیان کی جائے، جس سے مُلّا یا کسی دوسرے شخص کو انکار کی جرأت نہ ہو؟

۲۔ حضرت مُلّا صاحب! آپ کی نماز جلال اور جمال دونوں جوہروں سے خالی ہو چکی ہے۔ یعنی نہ اس نماز میں شان د

شوکت اور دبدبہ وہیبت کا کوئی رنگ نظر آتا ہے، نہ اس میں حسن و خوبی ہے کہ اسے دیکھ کر لوگوں کے دل نماز کی طرف مائل ہوں۔ پھر مُلّا صاحب جو اذان دیتے ہیں، وہ بھی رُوح سے خالی ہو چکی ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات نہیں کہ مسلمان کو اپنے زوال کی رات ختم اور عروج و ترقی کی صبح طلوع ہونے کا یقین پیدا ہو۔ اہل دل کی زبان سے صبح کے وقت اذان نکلے تو جو بھی سُنے گا، اس میں خدا کے لیے ایک خاص ولولہ اور شیفتگی پیدا ہو جائے گی، لیکن مُلّا صاحب کی نماز کی طرح ان کی اذان بھی قطعاً کوئی جذبہ پیدا نہیں کرتی۔ ایسے دینی رہنما قوم کو کیوں کر آگے لے جا سکتے ہیں؟

تقدیر

اس نظم میں تقدیر کے متعلق عام لوگوں کا نقطۂ نگاہ پیش کرتے ہوئے اصل حقیقت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔

جبروت: عظمت۔ بزرگی۔ جلال
منطق: علم معقول یعنی علم کی وہ شاخ جس میں کلام کے حق و ناحق ہونے کا فیصلہ دلائل کی بنا پر کیا جاتا ہے۔ کبھی یہ لفظ دلیل کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔
اُمم: اُمت کی جمع۔ قومیں۔
تیغِ دوپیکر: دو دھاری تلوار۔

۱۔ کبھی ایسا بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ نا اہل اور نالائق کو قوت و طاقت اور عظمت و بزرگی حاصل ہو جاتی ہے وہ مسندِ حکومت پر بیٹھ جاتا ہے اور سب پر حکم چلاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جن لوگوں کو قدرت نے قابلیت کے خاص جوہر عطا کیے، وہ باکمال زمانے میں ذلیل و خوار پھرتے نظر آتے ہیں۔

۲۔ شاید تقدیر کے اس فعل میں کوئی چھپی ہوئی حکمت موجود ہو۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ تقدیر کے کام عقل و دلیل کے تابع نہیں۔ وہ جو چاہے کرتی ہے۔

واضح رہے کہ تقدیر کے متعلق عام لوگوں کا نقطۂ نگاہ یہی ہے۔ وہ جب نا اہل کو دنیوی اعتبار سے سربلند اور اہل کو دنیوی اعتبار سے پست دیکھتے ہیں تو بہ اثر قبول کر لیتے ہیں کہ یہ سب کچھ تقدیر کا فعل ہے اور تقدیر دلیل کی بنا پر نہیں چلتی۔

۳۔ اقبال فرماتے ہیں: بے شک دنیا میں ایسی مثالیں ملتی ہیں، لیکن ایک حقیقت ایسی ہے، جو سب کو معلوم ہے۔ اور قوموں کی سرگزشت اس کی گواہی دے رہی ہے۔

۴۔ وہ حقیقت کیا ہے؟ یہ کہ تقدیر کی نظر ہر لحظہ اور ہر آن قوموں کے عمل پر رہتی ہے۔ یہ نظر کاٹ میں ایسی تیز ہے، جیسی دو دھاری تلوار۔

مراد یہ ہے کہ تقدیر قوموں کے اعمال دیکھتی رہتی ہے، جو قومیں جدوجہد میں سرگرم رہتی ہیں۔ ہمت، جاں بازی اور سرفروشی سے کام لیتی ہیں، وہ یقیناً ترقی کرتی اور عروج پاتی ہیں۔ جو حق و انصاف پر کاربند رہتی ہیں، ان کا عروج پائدار ہوتا ہے۔ جو قومیں ان اوصاف سے عاری ہیں، وہ اپنی نالائقی، نااہلی یا بدعملی کی بنا پر صفحۂ ہستی سے مٹا دی جاتی ہیں یا ذلیل و خوار ہو کر اپنی حیثیت کھو بیٹھتی ہیں۔ گویا بعض افراد کے مقابلے میں اگرچہ ایسی مثالیں ملتی ہیں جنھیں اس لیے معقول نہیں سمجھا جاتا کہ اول پورے اسباب ہمارے سامنے نہیں آتے۔ دوم دنیوی لحاظ سے بلندی یا پستی کسی انسان کی سیرت اور حسنِ عمل کی بنا پر عروج پاتی ہیں اور بدعملی کی بنا پر پست و ذلیل ہو جاتی ہیں۔ قرآن نے بھی یہی حقیقت بیان کی ہے:

ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (سُوْرَةُ اَنْفَال)

(آلِ فرعون اور ان سے پہلے مجرموں کے عذاب کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے) یہ بات اس لیے ہوئی کہ اللہ تعالیٰ جو نعمت کسی گروہ کو عطا فرماتا ہے اس کا مقررہ قانون ہے کہ اسے پھر کبھی نہیں بدلتا، جب تک خود اسی گروہ کے افراد اپنی حالت نہ بدل ڈالیں۔

توحید

علمِ کلام: وہ علم جس میں اسلامی عقائد کو دلیلوں کے ذریعے سے ثابت کیا جاتا ہے۔ مثلاً وجودِ باری تعالیٰ، نبوّت، حشر و نشر وغیرہ۔ **ضَو:** روشنی۔ **قُلْ ھُوَ اللّٰہُ:** اشارہ ہے سُورۂ اخلاص کی طرف جو توحید کا جامع مرقع ہے۔

۱۔ یہی توحید کسی زمانے میں دنیا کے اندر ایک زندہ اور جیتی جاگتی قوّت تھی۔ آج اس کی حیثیت کیا رہ گئی ہے؟ یہ کہ علمِ کلام کے دوسرے مسئلوں میں سے یہ بھی ایک مسئلہ ہے، جسے دلیلوں سے ثابت کیا جاتا ہے۔

۲۔ جب تک توحید کی روشنی سے عمل و سیرت کے اندھیرے میں اُجالا نہ کیا جائے، مسلمان سے خود اس کا مقام چھُپا رہتا ہے۔ یعنی اس پر آشکارا نہیں ہو سکتا کہ وہ کس غرض سے دنیا میں بھیجا گیا اور کون سے مقاصد کو پورا کرنا اس کے ذمّے ہے؟ جب تک توحید اس کے اعمال کا لازمی جزو نہ بن جائے، اس وقت تک مسلمان اپنے فرائض کا اندازہ ہی نہیں کر سکتا۔

۳۔ مسلمانوں کے قائدو اور رہنماؤ! میں نے تمھارے لشکر دیکھے ہیں۔ ان کے پاس جو میان ہیں، وہ قل ہو اللہ کی تلوار سے خالی ہیں یعنی توحید کی رُوح ان میں نظر نہیں آتی۔

۴۔ افکار و خیالات اور عقائد کی وحدت بہت اچھی اور بہت ضروری سہی، لیکن جب تک عمل و سیرت میں وحدت پیدا نہ ہو، اس میں پختگی نہیں آتی اور افکار کی وحدت خام رہتی ہے۔ افسوس کہ قومی زندگی کے اس بھید سے نہ علما کو آگاہی حاصل ہے، نہ فقیہوں کو۔

۵۔ ان لوگوں کو کیا معلوم کہ قوم کیا چیز ہے اور قوموں کی امامت کس طرح کی جاتی ہے؟ یہ بے چارے تو دو رکعتیں پڑھانے کے امام ہیں۔

علم اور دین

اس نظم میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ حقیقی علم دین سے الگ نہیں بلکہ اس کا لازمی جزو ہے۔

ندیم: رفیق۔ ساتھی۔ **کم بصری:** کم نظری۔

۱۔ جس علم کو خدا نے دل اور نظر کا رفیق بنا دیا، وہ اپنے تراشے ہوئے بتوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح توڑ پھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ یعنی جو علم خدا کی طرف سے دیا جاتا ہے، مثلاً آسمانی کتابیں، اس کی وجہ سے انسان کے عقائد و اعمال میں کوئی خلل نہیں آتا، بلکہ وہ گمراہ کرنے والی تمام چیزوں کو ختم کر دیتا ہے۔

۲۔ زمانہ ایک ہے۔ زندگی بھی ایک ہے اور کائنات بھی ایک ہے۔ پھر اس میں نئے اور پرانے کی تقسیم کا کیا مطلب؟ یہ تو کم نگاہی کی دلیل ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب زندگی اور اس کے زمانی و مکانی ماحول کی یکسانی میں کوئی شبہ نہیں تو پھر نئے اور پرانے زمانے کی تقسیم کا کیا مطلب ہے؟

۳۔ اگر شبنم کا قطرہ صبح کی ہوا کا ساتھ نہ دے تو باغ میں کلی کیونکر پرورش پا سکتی ہے؟

مراد یہ ہے کہ کلی کو شگفتہ کرنے کے لیے محض صبح کی ہوا کافی نہیں بلکہ شبنم کا گرنا بھی ضروری ہے۔ شبنم کلی میں ملائمت اور شادابی پیدا کرتی ہے۔ نسیم کے جھونکے اسے شگفتہ کر دیتے ہیں۔ جس طرح ان دونوں کی مدد سے کلی شگفتہ ہوتی ہے، اسی علم کی مدد سے دین کو تقویت پہنچتی ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ علم ایسا ہو جسے ہم دل اور نظر کا رفیق قرار دے سکیں۔ جس علم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تجلیات اور حکیم کے عقلی مشاہدات ایک دوسرے سے بغل گیر نہ ہوں، وہ علم ہی نہیں بلکہ جہالت ہے —— گویا جو علم نظر کی درستی اور دل کی پاکیزگی کے لیے ہو، وہ عین دین ہے اسے کم نظری کے داغ دھبوں سے بالکل پاک سمجھنا چاہیے۔

ہندی مسلمان

پارینہ: پرانا

۱۔ ہندوستان کے مسلمان کی حالت عجیب ہے۔ غیر مسلم اس بنا پر اسے وطن کا غدار قرار دیتے ہیں کہ اوّل وہ آزادی کی تحریک میں غیر مسلموں کا ساتھ نہیں دیتا اور اپنے حقوق کی بحث کھڑی کر دیتا ہے۔ دوم اس کی توجہ باہر کے اسلامی ملکوں پر بھی رہتی ہے اور ان کی خاطر وہ زیادہ سے زیادہ قربانی کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ انگریز یہ سمجھتا ہے کہ مسلمان بھکاری ہے۔ یہ کبھی انگریزوں سے ملازمتیں مانگتا ہے، کبھی اسمبلیوں میں اپنی نشستیں بڑھانے کا سوال پیش کر دیتا ہے۔

۲۔ پنجاب میں ایک "نبی" بھی گزرے ہیں۔ یعنی میرزا غلام احمد قادیانی۔ ان کے پیروؤں کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ پرانا صاحب ایمان مومن نہیں، کافر ہے۔ اس شعر میں اشارہ اس عقیدے کی طرف ہے جو قادیانیوں سے منسوب ہے کہ جو شخص میرزا غلام احمد کو نبی نہ مانے، وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔

۳۔ میرا مسکین دل اس کشمکش میں الجھا ہوا ہے کہ کچھ معلوم نہیں، حق کی آواز بلند ہو گی یا نہیں اور ہو گی تو کب اور کدھر سے ہو گی؟

آزادیٔ شمشیر کے اعلان پر

۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کے خلاف جو ہنگامہ بپا ہوا تھا اس میں کامیابی حاصل کر لینے کے بعد انگریز حکمرانوں نے تمام ہندوستانیوں سے ہتھیار لے لیے تھے اور پورے ملک کو نہتا کر دیا تھا۔ ۱۹۳۵ء میں اہل پنجاب کو تلوار رکھنے کی اجازت ملی۔ یہ شعر اسی موقع پر لکھے گئے تھے ــــــ **جگردار:** جوہر والی تلوار، جو کاٹ میں بے پناہ سمجھی جاتی ہو۔

۱۔ اے مسلمان! تجھے تلوار کی آزادی تو مل گئی۔ کبھی تو نے یہ بھی سوچا کہ فولاد کی جوہر دار تلوار کیا چیز ہے؟

۲۔ اگر ہم فولاد کی تلوار کو ایک مصرع فرض کریں تو یہ اُس شعر کا پہلا مصرع ہے، جس میں توحید کے بھید چھپے ہوئے ہیں۔

۳۔ مجھے تلوار کے مصرع کا زیادہ خیال نہیں، شعر کے دوسرے مصرع کا زیادہ خیال ہے، جس سے میری مراد فقیری اور درویشی کی تلوار ہے۔ اے مسلمان! کاش خدا تجھے یہ تلوار بھی عطا کر دے۔ یعنی تو فولاد کی تلوار کے علاوہ درویشی کی تلوار کا بھی مالک بن جائے۔

۴۔ دونوں تلواریں جس مومن کے قبضے میں آ جائیں وہ یا تو خالدؓ جاں باز بن جاتا ہے، جنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی تلوار (سیف اللہ) کا لقب عطا فرمایا اور جنھوں نے اسلام کے ابتدائی دور کی تمام جنگوں میں بے مثال فتوحات حاصل کیں یا وہ حضرت علی مرتضٰی اور شیر خدا بن جاتا ہے جن کی ذات با برکات ہر ستائش سے بے نیاز ہے۔

سورۂ حدید میں ارشاد ہوتا ہے:

لقد ارسلنا رسلنا بالبیّنٰت و انزلنا معھم الکتٰب و المیزان لیقوم النّاس بالقسط و انزلنا الحدید فیہ بأس شدید وّ منافع للنّاس و لیعلم اللہ من یّنصرہٗ و رسلہٗ بالغیب۔ انّ اللہ قویٌّ عزیز۔	ہم نے بھیجے اپنے رسول نشانیاں دے کر اور اتاری ان کے ساتھ کتاب اور ترازو تاکہ لوگ سیدھے رہیں انصاف پر اور ہم نے اتارا لوہا۔ اس میں سخت لڑائی ہے اور لوگوں کے کام چلتے ہیں اور یہ کہ اللہ معلوم کرے کون مدد کرتا ہے اس کی اور اس کے رسولوں کی بن دیکھے۔ بے شک اللہ زور آور ہے اور زبردست۔

اس ارشاد سے واضح ہے کہ خدا نے انبیاؑ کو کتاب اور میزان کے ساتھ جنگ کا ساز و سامان بھی عطا کیا تاکہ لوگوں کو راہِ حق پر قائم رکھیں۔ حق شناسوں کے لیے کتاب اور میزان ہی کافی ہیں۔ جو حق شناسی سے خالی ہوں اور مخالفت میں جنگ کے لیے تیار ہو جائیں، ان کے خلاف تلوار سے بھی کام لینا پڑتا ہے تاکہ ان سے لوگوں کو بچایا جا سکے اور فتنہ مٹ جائے۔ کتاب میزان کو خدا نے مقدّم رکھا اور تلوار کو پیچھے۔ غالباً یہی آیت اس نظم کے وقت اقبال کے پیشِ نظر تھی۔ کتاب و میزان ہی کو شاید انھوں نے فقر کی تلوار قرار دیا ہے اور اس کی زیادہ ضرورت بتائی ہے۔ یہ تلوار نہ ہو تو فولاد کی تلوار مقاصدِ حق کے لیے کچھ

کام نہیں کر سکتی کیونکہ وہ ہر نظم و پابندی سے آزاد ہو گی اور آزادی کی حالت میں حق و ناحق کی تمیز نہ کرے گی۔ اس لیے فتنہ و مصیبت بن جائے گی۔

جہاد

فال وفر: دبدبہ اور شکوہ۔ **محاسبہ:** پوچھ گچھ۔ جانچ پڑتال۔ باز پرس۔

۱۔ شیخ نے فتویٰ دے دیا ہے کہ اب قلم کا زمانہ آ گیا اور دنیا میں تلوار کام کی چیز نہیں رہی، لہٰذا اسے چھوڑ دینا چاہیے اور صرف قلم سے کام لے کر اسلام کی خوبیاں پیش کرنی چاہییں۔

اس مضمون کے فتوے یا اعلانات مختلف لوگوں کی طرف سے کیے گئے، جن میں قادیانی حضرات بھی تھے اور بعض دوسرے لوگ بھی۔ وہ سب انگریزوں کے طرف دار تھے۔

۲۔ اقبال پوچھتے ہیں: کیا فتویٰ دینے والوں پر یہ حقیقت روشن نہیں کہ مسجد میں اس قسم کی نصیحتیں فرمانا اور مسلمانوں کو یہ تلقین کرنا بالکل بے فائدہ اور بے اثر ہے؟

۳۔ کیوں؟ اس لیے کہ مسلمان کے ہاتھ میں تلوار اور بندوق ہے کہاں؟ یہ چیزیں تو مدت ہوئی، اس سے چھن چکی ہیں اور اگر کسی مسلمان کے پاس تلوار یا بندوق ہے بھی تو اس کا دل موت کی لذت سے بے خبر ہو چکا ہے۔ یعنی وہ موت سے ڈرتا ہے اور ایسے شخص سے راہِ حق میں جان دینے کی کیا امید ہو سکتی ہے؟

۴۔ مسلمان کا دل تو کافر کی موت سے بھی لرزتا ہے، یعنی وہ کافر کو مرتا ہوا دیکھتا ہے تو کانپ اٹھتا ہے ایسے مسلمان کو اسلامی موت مرنے کی تلقین کون کرے گا؟

مراد یہ ہے کہ جو غیر مسلم کو طبعی موت بھی مرتا ہوا دیکھ کر کانپنے لگے اس سے سچے مسلمان کی طرح خدا کی راہ میں جان دینے کی امید کیا ہو سکتی ہے؟ غرض ایسے مسلمانوں میں یہ تلقین کرنا بالکل بے فائدہ ہے کہ تلوار کا زمانہ نہیں، قلم کا زمانہ آ گیا۔

۵۔ جہاد چھوڑنے کی تعلیم اسے دینی چاہیے جس کے لہو بھرے پنجے سے دنیا کو طرح طرح کے خطرے ہوں۔ دنیا کو خطرے اسی سے ہو سکتے ہیں جس کے پاس بے اندازہ قوت ہو۔ لہو بھرے پنجے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ قوت

خونریزی اور ظلم و جور کی عادی ہے۔ خلقِ خدا کا خون بہاتے رہنے سے ہی اس کا ہاتھ لہو بھرا ہے۔

۶۔ یورپ باطل کی شان و شوکت اور دبدبہ و شکوہ محفوظ رکھنے کے لیے سراپا زرہ میں ڈوبا ہوا ہے۔ یعنی اس نے ہر قسم کے بے شمار ہتھیار جمع کر رکھے ہیں۔ ترکِ جہاد کی تلقین کا مستحق وہ ہے۔

۷۔ جس شیخ نے مسیحی حکمرانوں کی امداد کے خیال سے مسلمانوں کے لیے ترکِ جہاد کا فتویٰ دیا، ہم اس سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر جنگ مشرق کے لیے بُری ہے تو مغرب کے لیے بھی بُری ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ جنگ صرف مشرق کے لیے برائی ہے اور مغرب کے لیے بُرائی نہیں۔

۸۔ اگر آپ حق پرست ہیں اور سچّی بات دنیا کے سامنے لانا چاہتے ہیں تو کیا مناسب ہے کہ صرف اسلام سے پُوچھ گچھ اور بازپُرس میں لگے رہیں۔ یورپ کا معاملہ سامنے آئے تو اس کے بارے میں کچھ نہ کہیں اور یونہی درگزر کر جائیں۔

مطلب یہ ہے کہ تلوار کا جہاد ترک کر دینے کی تلقین اسے کرنی چاہیے جس کے پاس قوت ہے اور اس سے جا دبے جا کام لے رہا ہو نہ کہ مسلمان کو جس کے پاس قوت ہی نہیں۔

قوّت اور دین

سیلِ سُبک سیر: تیز چلنے والا سیلاب
سیلِ زمیں گیر: وہ سیلاب جو ساری دنیا میں پھیل جائے
زہرِ ہلاہل: ہلاک کر دینے والا زہر۔
تریاق: زہر کا توڑ۔ وہ شے جس سے زہر کا اثر دور ہو جائے۔

۱۔ دنیا میں سکندر و چنگیز جیسے جابروں اور ظالموں کے ہاتھوں انسان کا لباس سو بار تار تار ہوا۔ یعنی بڑی بڑی قوت کے مالکوں نے ظلم و جبر کے جنون میں انسانوں کا خون ہار ہا بے دریغ بہایا ہے اور انسانی شرافت کو پامال کیا ہے۔

۲۔ قوموں کی سرگزشت ابتدا سے ہمیں یہ پیغام دے رہی ہے۔ اے اہلِ نظر! قوت و طاقت کا نشہ بڑا خطرناک ہوتا ہے یعنی قوت کسی کے ہاتھ آجائے تو اس سے پھر تمیزِ نیک و بد کی امید نہ رکھنی چاہیے۔

۳۔ قوت کا سیل بڑا ہی تیز و تند ہوتا ہے اور ہر جگہ پھیل جاتا ہے۔ اس کے آگے عقل، بصیرت، علم اور ہنر گھاس پھوس کی طرح بہ نکلتے ہیں۔ یعنی ان کی کوئی قدر و قیمت باقی نہیں رہتی۔

۴۔ اگر قوت و طاقت دینِ حق کی پابندیوں سے آزاد ہو تو یہ ہلاک کر دینے والے زہر سے بھی زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔

لیکن اگر دین اس قوت کا سرپرست بن جائے اور اسے راہِ حق پر چلائے تو وہ ہر زہر کا تریاق بن جاتی ہے اور ہر برائی کو مٹا دیتی ہے۔

فقر و ملوکیّت

جنگاہ: میدانِ جنگ۔ **سازو یراق:** سازوسامان۔

۱۔ درویشی میدانِ جنگ میں آتی ہے تو اس کے ساتھ کوئی سازوسامان نہیں ہوتا۔ اخلاقی اور رُوحانی بیماریوں سے پاک دل سینے میں موجود ہو تو جبھی ہاتھ کی ضرب کاری ثابت ہوتی ہے۔

دنیا کی تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ پاک باز گروہوں نے ہمیشہ بے سروسامانی کی حالت میں بڑی بڑی جابر قوتوں کو شکست دی اور بے سروسامان گروہوں کی ضرب جہاں بھی پڑی، کاری ثابت ہوئی۔

۲۔ درویشی کی بے خوفی اور بے قراری ہر لحظہ بڑھتی رہتی ہے، اس وجہ سے ہر زمانے میں فرعون اور حضرت موسیٰؑ کا قصّہ دہرایا جاتا ہے۔ یعنی درویشی ہر باطل قوت کو مٹانے کے درپے رہتی ہے، جس طرح حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو مٹایا تھا۔ اس لیے حق و باطل کی جنگ ہر دور میں ہوتی رہتی ہے۔

۳۔ اے باغیرت درویشی! اب پھر تیرے ظہور کا زمانہ آنے والا ہے اس وقت حکمرانی کی باگ تیرے ہاتھ میں ہوگی اب تک یورپ دنیا پر مسلّط تھا۔ آیندہ حکومت تیرے قبضہ و تصرّف میں ہوگی۔ یورپ کی رُوح کو چاندی اور سونے کی ہوس کھا گئی۔ وہ مال و دولت کے لالچ میں ہر نیکی اور ہر خیر سے بے پروا ہوگیا۔

اگر تنہا فقر کا لفظ استعمال کرتے تو زر و سیم کے مقابلے میں فقر سے مفلسی مراد لیے جانے کا اندیشہ باقی رہتا۔ اقبال نے فقرِ غیور استعمال کیا یعنی وہ فقر جو اپنی غیرت و حمیّت کی بنا پر دنیوی مال و دولت سے بے نیاز اور مستغنی ہوتا ہے۔ دولت اس کے قبضے میں بھی آجائے تو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا۔ یورپ کی حرصِ زر کا جواب صرف فقرِ غیور ہو سکتا ہے۔

۴۔ عشق و مستی کے غلبے نے میرے لیے دل کی بات ضبط کیے رکھنے کی گنجائش نہ چھوڑی۔ جس طرح بادِ سحر کی لہریں کلی کو شگفتہ کر دیتی ہیں اسی طرح عشق و مستی نے میرے ضبطِ نفس کو بھی توڑ کر حق بات میری زبان پر جاری کر دی۔

اسلام

کد: چڑ، خفگی، نفرت

۱۔ خودی کا نور اور خودی کی حرارت دونوں اسلام کی رُوح ہیں۔ خودی کی حرارت زندگی کو منوّر کر کے اس میں ذاتِ باری تعالیٰ کی موجودگی کا احساس پیدا کر دیتی ہے۔

۲۔ اگرچہ اس روح کو قدرت نے آنکھوں سے پوشیدہ رکھا ہے۔ تاہم یہی ہر شے کی قوّت، استحکام اور مضبوطی ہے۔ یہی اس کے ظہور کی بنیاد ہے۔

۳۔ اگر یورپ کو اسلام کے لفظ سے چڑ ہے تو مضائقہ نہیں۔ ہم اسلام کا لفظ استعمال نہ کریں گے اسے باغیرت فقر کہیں گے جو اس دین کا دوسرا نام ہے۔

حیاتِ ابدی

قطرۂ نیساں: موسمِ بہار کی بارش کا قطرہ۔ ہر علم ادب کی خاص روایات ہوتی ہیں۔ فارسی ادب کی روایات میں سے ایک یہ ہے کہ بہار کے موسم کی بارش کا قطرہ سیپی میں پہنچ جائے تو وہ موتی بن جاتا ہے۔ فارسی کی پیروی میں اردو والے بھی اسی روایت سے کام لینے لگے۔ **خودنگر:** لفظی معنی اپنے آپ کو دیکھنے والا۔ مراد اس وجود سے ہے جو اپنے طبعی جوہروں کا صحیح اندازہ کر سکے۔ **خودگر:** لفظی معنی اپنے آپ کو بنانے والا۔ یعنی وہ وجود جو خداداد جوہروں سے کام لے کر اپنے آپ کو درجۂ کمال پر پہنچا سکے۔ **خودگیر:** لفظی معنی اپنے آپ کو پکڑنے والا ہے۔ مراد ہے اس وجود سے جو اعلیٰ پیمانے پر اپنی حفاظت کر سکے۔

۱۔ اگر زندگی کو سیپی فرض کرلیں تو خودی اس سیپی کے لیے موسم بہار کی بارش کا قطرہ ہے۔ جو سیپی قطرے کو اپنی آغوش میں تربیت دے کر موتی نہ بنا سکے وہ کس کام کی ؟

مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد خودی کی تربیت کے سوا کچھ نہیں۔ جو انسان یہ کام انجام نہ دے سکے وہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس نے زندگی اسی طرح ضایع کردی، جس طرح سیپی قطرے کو موتی نہ بنا سکنے کی حالت میں اپنی حیثیت ضایع کردیتی ہے۔

۲۔ اگر خودی خودنگر، خودگر اور خودگیر رہے۔ یعنی اپنے جوہروں کو پہچانے، ان سے کام لے کر اپنے آپ کو درجۂ کمال پر پہنچائے پھر اس درجے کی حفاظت میں سرگرم رہے تو یہ ناممکن نہیں کہ موت بھی انسان کو مار نہ سکے۔

مطلب یہ نہیں کہ خودنگر، خودگر اور خودگیر خودی پر موت وارد نہ ہوگی۔ مراد یہ ہے کہ موت ایسی خودی کی عظمت اور برتری کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ تاریخ کی شہرۂ آفاق ہستیاں خصوصاً انبیائے کرام کی سرگزشتیں اس دعوے کی روشن شہادتیں پیش کررہی ہیں۔

سُلطانی

اقبال کی تصریح کے مطابق یہ نظم ریاض منزل بھوپال میں لکھی گئی تھی، جہاں سر راس مسعود مرحوم بطور وزیر ریاست رہتے تھے۔ اور اقبال ایک مرتبہ علاج کی غرض سے بھوپال گئے تو انھیں کے پاس ٹھہرے تھے۔ اس نظم میں سلطانی کا اسلامی تصور بڑے ہی دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

قاہری : غلبہ۔ فاتحانہ شان۔ عیار: کسوٹی۔ ظلِّ سُبحانی : خدا کا سایہ۔

۱۔ جس درویشی میں قرآن کی روح بے پردہ جلوہ دکھائے، کسی کو کیا معلوم کہ اس درویشی کے ہزاروں مقام اور مرتبے اور ہزاروں رنگ روپ ہیں۔

۲۔ جب خودی دیکھ لیتی ہے کہ وہ سب پر غالب آگئی اور اس کی شانِ فاتحیت سب پر چھاگئی تو یہی مقام ہے، جسے عام لوگ سلطانی اور فرماں روائی کہتے ہیں یعنی سلطانی خودی کے غلبے اور زور و قوت کے کمال کا دوسرا نام ہے۔

۳۔ سلطانی اور فرماں روائی کا مقام مومن کی قوتوں کے لیے کسوٹی کا حکم رکھتا ہے۔ انسان اس کسوٹی پر

پورا اُترے تو وہ دنیا میں خدا کا سایہ اور پرتو بن جاتا ہے۔ اسی کو قرآن مجید میں مرتبۂ خلافت کہا گیا ہے۔ یعنی زمین پر خدا کا نائب۔

۴۔ واضح رہے کہ اس غلبے اور اس حکمرانی و فرمانروائی کو جبر و قہر سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو عشق و مستی کی ایک عملی کیفیت ہے۔ جبر اور قہر زور اور قوت کے بل پر دنیا کو زیر تم نہیں رکھا جا سکتا اور جہانبانی نہیں کی جا سکتی۔

مطلب یہ ہے کہ اسلامی سلطانی اور فرماں روائی لشکروں کے بل پر نہیں ہوتی۔ اس میں جبر و تشدد سے کام نہیں لیا جاتا، جیسا کہ عام بادشاہوں کا شیوہ ہے۔ اس میں دلوں پر حکومت کی جاتی ہے اور لوگ بصد شوق و ذوق اس حکومت کے ماتحت آتے اور اسے باعث شرف سمجھتے ہیں۔

۵۔ اپنے زمانے کے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں: تم لوگ اس لیے غلامی اور محکومی کی مصیبت میں مبتلا ہوئے کہ اپنی فقیری اور درویشی کی حفاظت نہ کر سکے۔ تم نے اپنی بدعملیوں سے وہ بیش بہا دولت کھو دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ حکمرانی اور فرمانروائی کے بجائے تم پر غلامی اور محکومی مسلّط ہو گئی۔

۶۔ جس اسلامیت کی پیشانی پر سجدے کا نشان چاندی کی طرح روشن تھا، وہ اسلامیت فرنگی نے خرید لی یعنی خدا کے سچے پرستار فرنگی کے محکوم بن گئے۔

۷۔ کسی زمانے میں اسلامی آسمان کے ستاروں کی چمک دمک چاند اور سورج کو بھی شرما رہی تھی، افسوس کہ اب وہ چمک دمک باقی نہ رہی۔

صوفی سے

۱۔ اے صوفی! تو معجزوں اور کرامتوں کی دنیا میں مگن ہے۔ تجھے ہر وقت یہی خیال رہتا ہے کہ عجیب و غریب کرشمے دکھائے تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ تیرے معتقد بن جائیں۔ اس کے برعکس میری نظر اس مادّی دنیا پر جمی ہوئی ہے، جس میں رات دن نئے نئے واقعے پیش آتے رہتے ہیں۔

۲۔ فکر و خیال کی جس دنیا میں تو وقت گزارتا ہے، اس کے عجیب اور نادر ہونے میں کوئی شبہ نہیں، لیکن اس سے زیادہ عجیب اور زیادہ نادر وہ دنیا ہے جسے زندگی اور موت کی دنیا کہتے ہیں۔

۳۔ تو تخیّلات کی دنیا کو چھوڑ اور ممکنات کی دنیا کا رُخ کر۔ یہ دنیا تجھے اپنی طرف بلا رہی ہے۔ ممکن ہے تیری نگاہ اس دنیا کی حالت و کیفیت بدل ڈالے۔

مراد یہ ہے کہ آج کل کے صُوفی جن مشغلوں میں لگے رہتے ہیں، وہ بجائے خود کچھ ہی ہوں۔ لیکن ان سے قوم، ملک اور عالم انسانیت کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟ اقبالؔ انھیں دعوت دیتے ہیں کہ اس پر توجہ کریں۔ جو حادثات، موت و حیات اور ممکنات کی دنیا ہے۔ جن لوگوں نے آج کل اس پر توجہ جما رکھی ہے۔ یعنی یورپ کے سائنس دان ان کا نقطۂ نگاہ سراسر مادّی ہے۔ اہلِ تصوّف متوجّہ ہوں تو مادّیت کے اندھیرے میں روحانیت کا نور پیدا کر سکتے ہیں۔

افرنگ زدہ

ان اشعار میں خطاب ان لوگوں سے ہے جو یورپی تہذیب میں ڈوبے ہوئے ہیں اور جنھوں نے اسی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔

ا

۱۔ تیرا وجود سر سے پاؤں تک صرف یورپی تہذیب کا پرتو ہے، اس لیے کہ تیری عمارت اسی تہذیب کے معماروں نے بنائی ہے۔ یعنی تیری ہر چیز یورپی تہذیب کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے۔ دل و دماغ، فکر و نظر، جسم و لباس غرض ہر چیز سے مغربیت ٹپک رہی ہے۔ اسلام کا تجھ میں کوئی جوہر موجود نہیں۔ ظاہر ہے کہ جیسے معمار ہوں گے، ویسی ہی عمارت بنے گی۔

۲۔ مگر ایک حقیقت واضح کر دینا ضروری ہے کہ تیرا خاکی جسم خودی سے بالکل خالی ہو چکا ہے۔ تو صرف ایک "میان" ہے، جس پر سنہری نقش و نگار ہیں، لیکن اس میان میں تلوار موجود نہیں۔

جو مسلمان نوجوان یورپی تہذیب میں ڈوبے ہوئے ہوں، ان کی صحیح کیفیت بیان کرنے کے لیے اس سے بہتر مثال پیش نہیں کی جا سکتی کہ وہ زر نگار نیام ہیں لیکن بے شمشیر۔

۲

پہلے دو شعروں میں یورپی تہذیب کے متوالوں کی ظاہری حیثیت بیان کی گئی تھی، اِن دو شعروں میں ان کی فکری خامیوں کا عبرت ناک نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں:

۱۔ اے مغربی تہذیب کے متوالے! تو یورپی علوم پڑھ کر خدا کا منکر ہو گیا اور کہنے لگا کہ خدا کا وجود ثابت نہیں ہوتا۔ مجھ سے پوچھے تو کہوں گا کہ خود تیرا وجود ثابت نہیں۔

۲۔ کیوں؟ اس لیے کہ وجود اسی حالت میں ثابت ہو سکتا ہے۔ جب انسان کی خودی بروئے کار آ جائے اور تو خودی سے بالکل خالی ہو چکا ہے۔ لہٰذا تو باقی جھگڑے چھوڑ اور اپنی فکر کر، اس لیے کہ تیرا جوہر نمود سے محروم رہا۔ یعنی تو اپنی ہستی نمایاں نہ کر سکا۔

تصوّف

یہ اشعار بھی ریاض منزل بھوپال میں لکھے گئے۔

ملکوتی: ملکوت سے منسوب۔ ملکوتی فرشتوں کی دنیا کو کہتے ہیں۔ یعنی پاکیزہ روحوں کا جہان۔ تصوف نے رُوحانی ترقی کے جو درجے مقرّر کر رکھے ہیں، ان میں ایک درجہ عالم ملکوت کا بھی ہے۔

مراقبہ: لفظی معنی نگہبانی کرنا۔ صوفیوں کی اصطلاح میں اس کا مطلب ہے خدا سے لو لگانا۔ یعنی سب شغل چھوڑ کر ذکرِ الٰہی میں مشغول ہو جانا۔

۱۔ اہلِ تصوف کی ملکوتی حکمت اور ان کا لاہوتی علم بہت بڑی چیز ہوں گے۔ لیکن اگر وہ ملّت کی مصیبتیں دور نہیں کر سکتے اور اس کے درد کی دوا نہیں بن سکتے تو ان سے کیا حاصل؟ وہ بالکل بے حقیقت ہیں۔

ان حضرات کے آدھی رات کے ذکر، ان کے مراقبے اور ان کا کیف و سرور اگر مسلمان کی خودی کی حفاظت نہیں کر سکتے تو سراسر بے کار ہیں۔

مراد یہ ہے کہ رُوحانی علوم یا مشغلے بجائے خود کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ان کی حیثیت اسلام اور مسلمانوں

کی خدمت کے لحاظ سے قائم ہوسکتی ہے، اس لیے کہ ہر روحانی کمال کا اصل مدعا یہی تھا۔

۳۔ جو عقل چاند اور ستاروں کا شکار کھیلتی پھرتی ہے وہ اگر عشق حق کی چھپی ہوئی لذّت کو فائدہ نہیں پہنچا سکتی تو قطعاً بے سود ہے۔

۴۔ اگر کوئی شخص عقل کی بنا پر محض زبان سے لَا اِلٰہ کہہ بھی دے تو اس سے کچھ حاصل نہیں۔ جس صورت میں اس کا دل اور نظر دونوں اسلامی رنگ میں رنگے ہوئے نہ ہوں، اسے کوئی حیثیت اور مقام حاصل نہیں ہوسکتا۔

مراد یہ ہے کہ عقلی دلائل کی بنا پر خدا کی توحید کا قائل ہوجانے سے کچھ نہیں بن سکتا، جب تک انسان کا دل اور نگاہ اسلامی رنگ میں نہ رنگے جائیں۔ جب تک قلب کی گہرائیوں سے اسلامی حقّانیت کی صدا بلند نہ ہو اور اسلامیت اُبل اُبل نہ پڑے۔ اسلام عقل و دلیل نہیں، ایمان و یقین اور عمل کا متقاضی ہے۔

۵۔ اگر میرے کلام سے بے ربطی، پریشانی اور انتشار ظاہر ہو رہا ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اگر صبح کی روشنی میں پریشانی یعنی پھیلاؤ نہ ہو تو وہ بالکل بے کار ہے۔ اقبال نے اس شعر کے دو مصرعوں میں پریشانی کا لفظ دو مختلف معنی میں استعمال کیا ہے۔ پہلے مصرع میں پریشانی کے معنی ہیں بے ربطی اور دوسرے میں پھیلنا اور بکھرنا۔ روشنی کا پھیلنا اور بکھرنا اس کی خاصیت اور فضیلت ہے۔ وہ اپنے کلام کو بھی قومی زندگی کے لیے صبح کی روشنی قرار دیتے ہیں۔

ہندی اسلام

الحاد: بے دینی یا دین سے پھر جانا۔

۱۔ ملّت یا قوم فقط فکر و عقیدہ کی یکسانی سے زندہ رہتی ہے۔ یعنی جو قوم فکر اور عقیدے کے اعتبار سے متحد نہ ہو وہ زندہ نہیں رہ سکتی اور نہ اسے زندہ سمجھنا چاہیے۔ جو الہام اس یک جہتی اور وحدت کو برباد کر دے، اسے الہام نہیں بے دینی اور لامذہبی سمجھنا چاہیے۔

۲۔ وحدت قوّتِ بازو کے بغیر محفوظ نہیں رہ سکتی۔ اس کے بچاؤ کے لیے عقل کام نہیں دے سکتی، اس لیے

کہ وحدت کو نقصان پہنچانے والی جتنی فتنہ انگیز قوتیں پیدا ہوں گی، ان سے مناظرے کرتے رہنا کوئی مفید نتیجہ پیدا نہ کرے گا۔ ایسے معاملات میں قوت ہی کارآمد ہو سکتی ہے۔

۳۔ اے خدا کے بندے! یعنی اے صوفی! تجھے یہ قوت حاصل نہیں، پھر اس دنیا میں تیرے لیے بہتر ہے کہ کسی غار میں جا بیٹھے اور اللہ اللہ کرتا رہے۔

۴۔ اسلام تو قوت بازو حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ وہ تو سلطانی، فرماں روائی اور خوش گوار امیدوں کا پیغام ہے۔ تو اب کوئی ایسا اسلام ایجاد کر جس کا تصوّف مسکینی، بیچارگی، محکومی اور دائمی مایوسی سکھائے اس لیے کہ تیرا تصوّف یہی ہے۔

۵۔ ہمارے ملاؤں کی حالت دیکھیے کہ انھیں ہندوستان میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے۔ اور وہ بیچارے سمجھ رہے ہیں کہ اسلام ہر پابندی سے آزاد ہے۔

یہ نکتہ خاص طور پر غور کا محتاج ہے کہ انگریزی عہد میں کم یا زیادہ شرعی احکام کی اجازت کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اسلام کی آزادی کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ علمائے حق کا فتویٰ ابتدا سے یہ تھا کہ اسلام آزاد نہیں رہا۔ اسی بنا پر انھوں نے ہندوستان کو دار الحرب قرار دیا تھا۔ وہ کہتے تھے کہ جن احکام و ارکان کی اجازت حاصل ہے وہ مسلمانوں کی قوت کا نتیجہ نہیں بلکہ حاکم کی رضا کا نتیجہ ہے اور اسے حاکم کی مصلحت شناسی یا تدبیر حکمرانی سمجھنا چاہیے۔ آزادی اسی کو کہیں گے جس کی بنا مسلمانوں کی قوت ہو۔ عام علما نے اس جزوی آزادی کو آزادی سمجھ لیا اور ہندوستان کو دار الحرب ماننے سے انکار کر دیا۔ اقبال علمائے حق کے ہم خیال ہیں۔

غزل

سپلے سپر: افسردہ۔ بجھی ہوئی۔

۱۔ اے مخاطب! تیرا دل جذبۂ عشق سے خالی ہونے کے باعث مُردہ ہے۔ اسے پھر زندہ کر لے۔ کیونکہ قوموں کی پُرانی بیماری کا علاج اس کے سوا اور کسی چیز سے نہیں ہو سکتا۔

مطلب یہ کہ ملتِ اسلامیہ پر زوال کی ایسی افسردگی چھائی ہوئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے اس میں روح حیات مر چکی ہے۔ اسے چاہیے کہ پھر اس روح کو زندہ کرے، ہمت و جواں مردی سے کام لے اور زوال کی مصیبتوں سے نجات حاصل کرے۔ قوموں کے پرانے مرض یعنی زوال کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں۔

۲- تیرے سمندر پر سکون اور خاموشی چھائی ہوئی، جو سمندروں پر وقتاً فوقتاً چھا جاتی ہے یا کسی نے جادو کر رکھا ہے؟ یہ عجیب سمندر ہے کہ نہ اس میں مگرمچھ ہے، نہ کبھی طوفان آتا ہے، نہ کناروں پر ٹوٹ پھوٹ کے نشان نظر آتے ہیں۔ یہ سمندر کس کام کا؟ اس پر کبھی تو جوش کی کیفیت طاری ہونی چاہیے۔

مراد یہ ہے کہ تیرے دل میں بیداری اور آزادی کی کوئی امنگ، کوئی ولولہ اور کوئی جذبہ لہریں نہیں لیتا۔ تجھ پر یکسر افسردگی اور مایوسی طاری ہے، جس نے تیری حقیقی حیثیت زائل کر رکھی ہے۔

۳- تو بھی آسمان کے پوشیدہ بھید سے واقف نہیں۔ ستارے کا غمزہ تجھ میں تڑپ پیدا نہیں کرتا۔

حاصل یہ کہ تو نے نظامِ عالم کا بغور مطالعہ نہیں کیا۔ اس کے قوانین کو نہیں سمجھا۔ فطرت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ہر شخص کو آزاد زندگی بسر کرنی چاہیے۔ تو بھی آزادی حاصل کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے۔

۴- میری بجھی ہوئی راکھ میں جو ایک شرر چھپا ہوا تھا، اسے میرے صبح کے نغمے نے تیرے سرکنڈوں کے جنگل پر گرا دیا۔ یعنی میرے زندگی بخش کلام نے تیرے مردہ دل میں ایک نئی روح پھونکنے کا انتظام کر دیا۔ خدا کرے کہ یہی شرارہ تجھے عشقِ حق کی حرارت سے گرما کر سراپا سوز بنا دے۔

۵- گزری ہوئی اور آنے والی کل کا یہ جہان اسی کو دکھائی دے گا، جسے میری طرح نظارہ کرنے کا جوہر ہاتھ آئے۔

مطلب یہ کہ جو شخص میرے نقطۂ نگاہ سے دنیا کی حقیقت پر غور کرے گا، وہی نظامِ عالم کا بھید سمجھ سکے گا۔ اس طرح اس میں آزادی کی ایک بے پناہ تڑپ پیدا ہو جائے گی اور وہ موت کی پستی سے نکل کر زندگی کے اوج پر جلوہ گر ہو جائے گا۔

دُنیا

اس نظم میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ یہ دنیا اور اس کے مختلف نظارے دراصل انسان کے حواس کا کرشمہ ہیں۔

بوقلمونی : رنگارنگی۔

۱۔ مجھے بھی دنیا میں رنگ رنگ کی چیزیں نظر آتی ہیں۔ کہیں چاند ہے، کہیں تارا، کہیں پتھر ہے، کہیں نگینہ۔

۲۔ میری بصیرت کی آنکھ کا فتویٰ بھی یہی ہے کہ وہ پہاڑ ہے، یہ دریا، وہ آسمان ہے اور یہ زمین۔

۳۔ لیکن سچی بات کو چھپانا میری عادت نہیں۔ حق یہ ہے کہ وجود صرف تیرا ہے اور جو کچھ مجھے نظر آتا ہے۔ یہ بے وجود ہے اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

نماز

ان دو شعروں میں نماز کا درجہ واضح کیا گیا ہے اور اسی سے توحید کی حقیقت بھی آشکارا ہو جاتی ہے۔

۱۔ اگرچہ انسان کو زمین کی پشت پر آباد ہوئے ہزاروں سال گزر گئے، یہاں تک کہ کہا جا سکتا ہے، وہ بوڑھا ہو گیا۔ یعنی اس کے ظہور پر لمبی مدت گزر چکی ہے اور اس نے خاصے تجربات حاصل کر لیے ہیں لیکن یہ بُت، یہ لات و منات انسان کے بڑھاپے کے مقابلے میں بہت جوان ہیں۔ ان کی قوت اور اثر و رسوخ میں کمی نہیں آئی۔ اور ہر زمانے میں یہ نئے نئے بھیس بدل کر آ جاتے ہیں۔

بُت پرستی ہے کیا؟ یہ کہ انسان خدا کو چھوڑ کر اپنی مرادیں غیروں سے طلب کریں۔ خواہ وہ پتھر کی مورتیاں ہوں یا استھان۔ اگر کسی پیر یا عالم یا بادشاہ یا حاکم یا وزیر کے تعلق میں وہی طریقہ اختیار کیا جائے جو پرانے زمانوں کے

لوگ بتوں کے تعلق میں اختیار کر لیتے تھے تو وہ بھی بُت پرستی ہی بن جائے گی۔ مرادیں پوری کرنے والا صرف خدا ہے وہی رزق دیتا ہے۔ وہی زندگی بخشتا ہے۔ وہی حفاظت کرتا ہے۔ اسی کے ہاتھ میں تمام معاملات کی باگ ڈور ہے غیروں کے آگے جھکنا یا انھیں مُرادیں پوری کرنے والے ماننا یا ان سے ہر شے کی اُمّید رکھنا اس لیے غلط ہے کہ اپنے جیسے ان بندوں کو خدا کی صفات میں شریک کرنا ہے۔ ہمارے زمانے میں لوگ پتّھر کے بتوں کو نہیں پوجتے، لیکن اربابِ اقتدار کے سامنے اس طرح جھکتے ہیں، جس طرح صرف خدا کے سامنے جھکنا چاہیے اور انھیں کو دنیوی ترقیات کا اصل ذریعہ مانتے ہیں۔ اسی لیے اقبالؔ نے کہا کہ انسان بوڑھا ہوگیا۔ بُت پرستی بدستور جوان رہی وہ ہر زمانے کے حالات کے مطابق بھیس بدل کر آجاتی ہے اور لوگ خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پوجا شروع کر دیتے ہیں۔

۲۔ نماز کیا سکھاتی ہے؟ یہ کہ صرف خدا کو سجدہ کیا جائے۔ یہی توحید کی تعلیم ہے۔ خدا ہی کو تمام معاملات کا مالک و مختار ماننا چاہیے اسی کے آگے ہاتھ پھیلانا زیبا ہے۔ اب غور فرمائیے کہ خدا کے روبرو سجدہ کرتے ہی انسان ہزاروں سجدوں کی مصیبت سے نجات پا جاتا ہے، اس لیے کہ وہ نہ بتوں کے آگے جھکتا ہے۔ نہ پیروں، فقیروں، وزیروں اور حاکموں کی نیازمندی کا طوق اپنی گردن میں ڈالتا ہے۔ خدا کا سچّا بندہ بن جانے کے بعد دنیا کی تمام بندگیوں سے نجات پا جاتا ہے۔ افسوس کہ آج کل مسلمانوں کو خدا کے روبرو یہ سجدہ بھی گراں گزرتا ہے۔ جو انھیں ہزاروں سجدوں سے چھٹکارا دلا دیتا ہے۔

وحی

۱۔ عقل کے پاس وہم و گمان کے سوا کیا پونجی ہے؟ یہ بے حیثیت اور بے مایہ شے امامت اور رہنمائی کے لائق نہیں اگر وہم و گمان کو رہنما بنا لیا جائے تو زندگی کا کاروبار درہم برہم ہو کر رہ جائے۔

۲۔ جس وجود کی قوّتِ فکر بے نور ہو اور اس میں روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہ دے۔ جس کا جذبۂ عمل بے بنیاد ہو۔ اور وہ کسی پختہ اصول پر مبنی نہ ہو تو سوچو کہ اس کی زندگی کی تاریک رات میں اُجالے کی صُورت کیا ہو سکتی ہے؟ زندگی کا اُجالا دو باتوں پر موقوف ہے: اوّل یہ کہ سوچنے سمجھنے اور جاننے بوجھنے کی قوت نورِ حق سے منور

ہو۔ اتنی روشن ہو کہ جو سوچے، صحیح سوچے۔ دوسرے جو بھی کام کرے، کوئی مقصد اور نصب العین سامنے رکھ کر کرے۔ یہ باتیں زندگی کو صحیح معنی میں نتیجہ خیز بنا سکتی ہے، ورنہ وہ بالکل بے مصرف ہوگی اور اس کی حیثیت ایک اندھیری رات کے سوا کچھ نہ سمجھی جائے گی۔

۳۔ اچھے اور برے، نیک اور بد کام کی گتھی سلجھ نہیں سکتی۔ جب تک خود زندگی زندگی کے بھید آشکارا نہ کرے۔

مطلب یہ ہے کہ ہدایت و رہنمائی کی طلب زندگی کے طبعی اور فطری تقاضوں میں سے ایک تقاضا ہے اور انسانوں کے لیے حقیقی ہدایت و رہنمائی اسی صورت میں کارآمد ہو سکتی ہے کہ وہ انسانی زندگی کے بھیس میں آئے اور ہمارے سامنے عملاً اچھے برے کی حقیقت واضح کر دے۔

وحی کی اصلیت اس کے سوا کچھ نہیں۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر قرآن مجید نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مُرقع زندگی کو اُسوۂ حسنہ قرار دیا۔ لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ۔ اسی صورت میں زندگی نے زندگی کے بھیدوں کی شرح کی۔

اقبال نے خود تصریح فرمائی ہے کہ یہ اشعار ریاض منزل بھوپال میں لکھے گئے ہیں۔

شکست

اس نظم میں یہ نکتہ واضح کیا گیا ہے کہ زندگی کی کشمکش میں مردانہ وار حصہ نہ لینا اور میدان چھوڑ کر بھاگتے پھرنا ہی اصل میں شکست ہے۔

الست: اشارہ ہے اس آیت کی طرف جس میں الست بربکم آیا ہے۔

واذ اخذ ربك من بنی آدم من ظهورهم ذریتهم واشهدهم علی انفسهم الست بربكم قالوا بلی شهدنا ان تقولوا یوم القیامة انا كنا عن هذا غافلین۔ (سورۂ اعراف)

اور جب نکالی تیرے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے اُن کی اولاد اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر کہ کیا میں نہیں ہوں تمھارا رب؟ بولے۔ ہاں، ہے، ہم اقرار کرتے ہیں۔ (یہ اقرار تمھیں اس لیے یاد دلایا) مبادا قیامت

کے دن کہنے لگو کہ ہم کو اس کی خبر نہ تھی۔

اس ارشاد کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی ہستی کا اعتقاد انسان کی فطرت میں رکھ دیا گیا ہے۔ شاعری اور تصوف میں صرف لفظ الست اس پوری آیت یا خدا کی ہستی کے ازلی اقرار کا قائم مقام بن گیا۔

۱۔ ہمارے عہد کے صوفیوں میں وہ گرمی اور وہ حرارت باقی نہ رہی، جس کی برکت سے وہ ہر لحظہ میدانِ حق کے مجاہد بنے رہتے تھے۔ اب وہ زبان سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے تو الست کی شراب پی رکھی ہے، یعنی خدا کی ہستی کے اسی اقرار کی مستی میں گم ہیں جو ہم نے ازل کے دن کیا تھا۔ دراصل یہ بے عملی کا ایک بہانہ ہے۔ ان میں حق کے لیے ایثار و قربانی کی ہمت نہیں رہی۔ وہ ہاتھ پاؤں توڑ بیٹھے۔ ظاہر یہ کر رہے ہیں کہ وہ خدا کے عشق میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

۲۔ عالموں کی حالت ملاحظہ ہو۔ انھیں جب نظر آیا کہ شریعت کے احکام صاف صاف بتانے میں خطرات ہیں اور حاکموں سے لڑائی مول لیے بغیر چارہ نہیں تو انھوں نے بھی دنیا سے الگ تھلگ رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے سوا انھیں کوئی راستہ نظر نہ آیا۔ اس لیے کہ حاکموں کا مقابلہ کرتے تو انھیں گوناگوں تکلیفیں پیش آتیں۔

۳۔ غرض یہ بہادر جو زندگی کی کھینچ تان میں سب سے آگے رہنے کے حق دار تھے، گھبرا کر میدان سے بھاگ نکلے۔ اب سوچیے کہ اس گریز کو شکست قرار نہ دیا جائے تو شکست اور ہے کیا چیز؟

عقل و دل

۱۔ ہر خاکی اور نوری وجود، ہر مادی و غیر مادی شے پر عقل حکمران ہے۔ اس کی زد سے کوئی چیز باہر نہیں۔

۲۔ اسے (عقل کو) ازل سے جو شان و عظمت حاصل ہے، سارا جہان اس کے سامنے جھکا ہوا ہے۔ پوری کائنات میں سے ایک دل ہے جو ہر لحظہ عقل سے الجھتا اور جھگڑتا رہتا ہے۔

مستیٔ کردار

اس نظم میں موجودہ دور کے صوفیوں، ملّاؤں اور شاعروں کی عام کیفیت واضح کی گئی ہے۔

۱۔ صوفی طریقت کی پیری کا دعوی دار ہے اور اپنے باطنی احوال ہی میں مست رہتا ہے۔ مُلّا جو شریعت کا ترجمان ہے، صرف باتوں ہی میں مست رہنے کو درجۂ کمال سمجھتا ہے۔

۲۔ ہمارے عہد کے شاعروں کی حالت کیا ہے؟ ان کے نغمے یعنی شعر مردہ، افسردہ اور بے ذوق ہیں۔ نہ ان سے قوم میں زندگی کی کوئی تڑپ پیدا ہوتی ہے۔ نہ عمل کا کوئی جوش دلوں میں لہریں لیتا ہے۔ وہ اپنے خیالات اور افکار میں گم ہیں۔ نہ سوتے نہ جاگتے۔

۳۔ افسوس کہ مجھے وہ مجاہد جواں مرد کہیں نظر نہیں آتا، جس کی رگ رگ اور نس نس پر عمل کی مستی چھائی ہوئی ہو۔

گویا نہ مستیٔ احوال سے قوم کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، نہ نری گفتار سے اور نہ بے ذوق شاعری سے قوم کی حالت پلٹنے کے لیے جوش و ہیجانِ عمل کی ضرورت ہے۔

قبر

۱۔ قلندر یعنی خدا مست درویش کو مر کر بھی سکون و آرام نہ ملا اور قبر کی خواب گاہ بھی اسے راس نہ آئی۔

۲۔ قبر میں آسمانوں کی خاموشی تو موجود ہے، لیکن آسمانوں کی سی وسعت اور کشادگی موجود نہیں۔ گویا خدا مست درویش ایسی زندگی کا طلب گار ہے، جس میں خاموشی تو ہو، لیکن اس کے ساتھ ایسی وسعت و کشادگی ہو کہ وہ جدھر چاہے آزاد پھرے۔

قلندر کی پہچان

ہنگامہ: مقام۔ **محاسب:** حساب لینے والا۔ **مرکب:** سواری۔ **راکب:** سوار۔

۱۔ قلندر جواں مرد درویش ہے۔ زمانے سے پکار کر کہتا ہے کہ تو دنیا کو اپنے پیچھے چلانے کا عادی ہے میں بندۂ حق ہوں۔ تجھ کو حکم دیتا ہوں کہ جدھر میں جا رہا ہوں تو بھی ادھر چل۔

۲۔ میں جو ہنگامے پیدا کر سکتا ہوں، تو ان کی تاب نہیں لا سکتا۔ وہ تیری طاقت سے بالا ہیں۔ تو خیمہ چاہتا ہے تو قلندر کی قیام گاہ سے بچتا ہوا نکل جا۔

۳۔ اسے زمانے! اگر تو چڑھتا ہوا دریا ہے تو مجھے مطلق پروا نہیں۔ میں کبھی کشتی اور ملاح کا محتاج نہیں ہوا اور نہ یہ محتاجی قبول کروں گا۔ لہٰذا تیرے لیے بہتر یہی ہے کہ تو جوش و خروش نہ دکھا بلکہ اتر جا یعنی پایاب ہو جا۔

۴۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ میرا نعرۂ تکبیر تیرا طلسم توڑ چکا ہے؟ اگر تجھ میں اس حقیقت سے انکار کی جرأت ہے تو کر دیکھ۔

۵۔ میں قلندر ہوں، سورج، چاند اور تاروں کا حساب لیتا ہوں۔ میں زمانے کی سواری نہیں بلکہ اس کا سوار ہوں یعنی زمانے کی مرضی پر نہیں چلتا بلکہ اسے اپنی مرضی پر چلاتا ہوں۔

فلسفہ

غوّاص : غوطہ لگانے والا۔ نزع : جاں کنی کی حالت ۔

۱۔ جوانوں کے خیالات ، پوشیدہ ہوں کہ ظاہر ، وہ قلندر کی نظر سے چھُپے نہیں رہ سکتے ۔

۲۔ اے مسلمان نوجوان ! میں تیرے حالات سے بخوبی واقف ہوں جو کچھ تجھ پر گزر رہی ہے اس سے اچھی طرح باخبر ہوں ۔ اس لیے کہ مدت ہوئی میں بھی اسی راستے سے گزرا تھا جس میں تو چل رہا ہے ۔ دیکھ میں تجھے سمجھاتا ہوں کہ عقل مند آدمی لفظی بحثوں اور عبارت کے ہیر پھیر میں نہیں الجھا کرتے ۔ غوطہ لگانیوالے کو موتی سے کام ہوتا ہے سیپی سے کیا مطلب ؟

اس شعر میں الفاظ کو سیپی اور معنی کو موتی قرار دیا ۔

۴۔ وہ عقل صرف عاشقانِ حق ہی کے حلقے میں مل سکتی ہے جو چنگاری کو دیکھ کر شعلے کا پتا لگالے اور چمک سے آگ کا اندازہ کرلے ۔

ممکن ہے اس میں حضرت موسٰی علیہ السلام کے واقعے کی طرف اشارہ ہو کہ وہ حضرت شعیبؑ کے پاس سے مصر کی طرف روانہ ہوئے تو راستے میں رات کے وقت دور آگ کی چمک دیکھی اور اہلِ خانہ سے کہا کہ یہیں ٹھہرو میں آگ لے کر آتا ہوں ۔ اسی سلسلے میں خدا نے انھیں پیغمبری کا منصب عطا کردیا ۔

۵۔ جس پیچ دار مطلب کی تصدیق دل کرے وہ چمکیلے موتی سے بڑھ کر قیمتی ہوتا ہے یعنی اصل معیار اور کسوٹی عقل کی تصدیق نہیں بلکہ دل کی تصدیق ہے ۔

۶۔ جو فلسفہ جگر کے لہو سے نہ لکھا جائے یعنی جس کی تصدیق انسان کا دل اور روح نہ کریں اس کے متعلق یا تو یہ سمجھنا چاہیے کہ مر چکا ہے یا یہ سمجھ لیجیے کہ اس پر جاں کنی کی حالت طاری ہے ۔

مردانِ خدا

حرب : جنگ۔

۱۔ بندۂ آزاد یا خدا کا مقبول بندہ وہی ہے جس کا وار کاری ہو۔ یعنی جس مقصد کے لیے وہ کوئی ضرب لگائے، اسے پورا کردے۔ اسے بندۂ حُر نہیں کہہ سکتے، جس کی جنگ مکّاری اور عیاری پر مبنی ہو۔

۲۔ قلندر رہنا، قبا پہننا اور تاج سر پر رکھنا یعنی درویشی اور سلطانی الگ الگ صفتیں سمجھی جاتی ہیں، لیکن خدا کے پاک بندوں کی فطرت میں روزِ ازل سے یہ صفتیں پہلو بہ پہلو چلی آتی ہیں۔ وہ درویشی کے باوجود سُلطانی کرتے ہیں اور تختِ سلطنت پر پہنچ جانے کے باوجود درویش رہتے ہیں۔

۳۔ انھیں کی خاک میں وہ چنگاری چھپی ہوتی ہے، جسے زمانہ اٹھا کر آفتاب بنا دیتا ہے۔

مُراد یہ ہے کہ اُن کے دل اور رُوح سے عشقِ حق کی جو چنگاریاں نکلتی ہیں، وہ مدّت تک زمانے کے لیے ہدایت و رہنمائی کا سرچشمۂ نور بنی رہی ہیں۔

۴۔ وہی ہیں، جو خدا کے سوا کسی کو نہیں پُوجتے۔ انھیں کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ وہ ہر غیر اللہ شے کو بُت سمجھتے ہیں اور ان بتوں کا طواف نہیں کرتے، ورنہ اے خدا! تیرے مومن اور کافر سب کے سب کم و بیش بتوں کے پجاری ہیں، گویا انھوں نے زنّار باندھ رکھے ہیں۔

کافر و مومن

سم : زہر۔ بُرّندہ : کاٹنے والا۔ صیقل زدہ : صیقل کیا ہوا، چمکایا ہوا۔ برّاق : بجلی کی طرح چمکیلا۔

۱۔ کل میں سیر کو نکلا تو دریا کے کنارے حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات ہوئی۔ حضرت نے پوچھا کہ کیا یورپی تہذیب کے زہر کا تریاق ڈھونڈ رہا ہے؟

۲۔ میں تجھے ایک نکتہ بتاتا ہوں جو تلوار کی طرح کاٹ کرنے والا صیقل کیا ہوا، روشن اور چمکیلا ہے۔
شعر کے دوسرے مصرع میں جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں، وہ سب تلوار کے اوصاف ہیں۔ نکتہ تلوار کی مانند ہوا تو اس میں یہ اوصاف پیدا ہو گئے۔

۳۔ کافر کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو کائنات میں گم کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس مومن کی پہچان یہ ہے کہ کائنات اس میں گم ہو جاتی ہے۔

مطلب یہ کہ کافر یا تو کائنات کی تمام چیزوں سے ڈرتا ہے اور اُن کی پوجا میں لگ جاتا ہے۔ مثلاً: پرانے زمانے میں لوگ چاند، تاروں، سورج، سانپ، دریا، پہاڑ وغیرہ چیزوں کی پوجا کرتے تھے۔ یا وہ دنیا کی چیزوں میں دل لگا کر اس طرح مگن ہو جاتا ہے کہ خدا کو بھی یاد نہیں رکھتا۔ ایک صورت اور بھی ہے، جو یورپ کے سائنس دانوں نے اختیار کی۔ وہ مادی چیزوں کے کھوج میں اس طرح گم ہو گئے کہ سب کچھ بھلا دیا۔ بے شک انھوں نے عجیب و غریب چیزیں ایجاد کر لیں، لیکن وہ خدا سے غافل ہو گئے اور ان کی ایجاد کی ہوئی چیزوں سے عالمِ انسانیت کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچا۔

اس کے برعکس مومن اپنے آپ کو خدا میں گم کر دیتا ہے۔ اس وجہ سے کائنات کی ہر شے پر حکم چلاتا ہے۔ اس کا عقیدہ ہی یہ ہے کہ کائنات بندۂ حق کی خدمت کے لیے پیدا ہوئی۔ خدا نے انسان کو اشرف المخلوقات کا درجہ دیا۔ دنیا میں اس درجے کے حق دار صرف مومن ہیں۔ لہٰذا کائنات ان میں گم ہوتی ہے۔

مہدیِ برحق!

محبوس: قیدی۔ **خاور:** سرزمین مشرق۔ **ثوابت:** ثابت کی جمع۔ وہ ستارے جن کے متعلق پرانے نجومیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ گردش نہیں کرتے۔ **سیّار:** گردش کرنے والے ستارے۔ **جدّت:**

نئی بات۔ نیاپن۔ **مہدی:** ہدایت کرنے والا۔

ا۔ مشرق کی وہ قومیں ہوں جو اپنی پرانی حالت پر جمی بیٹھی ہیں یا مغرب کی وہ قومیں ہوں جو ترقّی کے میدان میں تیز دوڑی جا رہی ہوں۔ دونوں کی حالت یہ ہے کہ اپنے خیالات اور افکار کے جو قید خانے انھوں نے بنا رکھے ہیں ان میں قید ہیں۔ یعنی مشرقیوں کی بے حسی اور بے عملی یا مغربیوں کی ترقی پسندی دونوں میں کوئی بھی بات توجّہ کے قابل نہیں۔

۲۔ مسیحیت کے پیشواؤں یا کعبے کے شیخ، دونوں میں نہ گفتگو کا نیا پن ہے نہ عمل کا یعنی ان کی باتیں بھی پُرانی ہیں اور عمل بھی پُرانا۔ نہ سُوجھ بُوجھ کا ذوق ہے نہ چھان بین کا شوق۔ نہ حقیقت کو خود سمجھتے ہیں نہ سمجھا سکتے ہیں۔

۳۔ سیاست دانوں کو دیکھو تو وہ بھی اسی ہیر پھیر میں اُلجھے ہوئے ہیں، جس سے پُرانے زمانے میں کام لیا جاتا تھا شاعروں کے خیالات بالکل سطحی اور پست ہیں۔ سمجھنا چاہیے کہ ان کے پاس خیالات کا کوئی قابلِ ذکر سرمایہ ہے ہی نہیں۔

۴۔ آج دنیا کو اس سچّے اور برحق مہدی کی ضرورت ہے جس کی ایک نظر سے افکار و خیالات کی دُنیا لرز اُٹھے اور اس میں انقلاب پیدا ہو جائے۔

مومن

(دُنیا میں)

بریشم: ابریشم۔ ریشم کے کیڑے کا کویہ، جس سے ریشم کے تار نکالے جاتے ہیں۔ **کنجشک:** چڑیا۔

حمام: کبوتر

ا۔ دوستوں اور خویشوں کے حلقے میں مومن ابریشم کی طرح نرم اور مُلائم ہوتا ہے۔ اگر حق اور باطل کے درمیان لڑائی چھڑ جائے تو مومن فولاد بن جاتا ہے۔

مومن کے یہ اوصاف قرآن سے ماخوذ ہیں۔ ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے: اشدّاء علی الکفّار رحماء بینھم ——— زورآور ہیں کافروں پر، نرم دل ہیں آپس میں ——— دوسری جگہ ارشاد ہوا: اذلّۃٍ علی المؤمنین اعزّۃٍ علی الکافرین ——— نرم دل ہیں مسلمانوں پر، زبردست ہیں کافروں پر ———

۲۔ وہ آسمانوں سے مقابلہ کی کھینچ تان میں لگا رہتا ہے۔ اگرچہ اس کا جسم خاکی ہے لیکن خاک سے آزاد ہی رہتا ہے۔

مُراد یہ ہے کہ جو حادثے یا بلائیں اس پر نازل ہوتی ہیں یا مشکلات پیش آتی ہیں، مردانہ وار ان کا مقابلہ کرتا ہے اور ہمت کبھی نہیں ہارتا۔ عام انسانوں کی یہ حالت نہیں۔ وہ مشکلات سے گھبرا جاتے ہیں اور حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں۔ صرف مومن ان چیزوں سے بالا رہتا ہے۔

۳۔ اس کی نظر چڑیا اور کبوتر پر کبھی نہیں پڑتی۔ وہ جبرائیلؑ اور اسرافیلؑ کا شکار رکھتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ اس کے مقاصد بہت بلند ہوتے ہیں اور وہ قدوسیوں سے بھی آگے نکل جانا چاہتا ہے۔ یہ دنیا میں مومن کی کیفیت ہوتی ہے۔ وہ جنّت میں پہنچ جاتا ہے تو اس کی حالت کا نقشہ یوں پیش کیا گیا ہے۔

(جنّت میں)

۴۔ فرشتے کہتے ہیں کہ مومن کی شخصیت بڑی ہی دلکش اور دلآویز ہے۔ ان کے برعکس حوروں کو شکایت ہے کہ مومن ان سے زیادہ میل جول نہیں رکھتا۔ وجہ یہ کہ مومن کا مقصود باری تعالیٰ کا دیدار ہے اور وہ اسی شوق میں گم رہتا ہے۔

محمّد علی بابؑ

باب کا نام محمّد علی تھا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ غلطی کاتب سے ہوئی یا جو مسودہ اس کے حوالے کیا گیا اس میں یونہی مرقوم تھا۔ بہرحال باب اس امر کا دعویدار تھا کہ مجھے **مہدی موعود** کی تشریف آوری کے لیے زمین تیار کرنے کی غرض سے بھیجا گیا ہے اور میں ہی وہ دروازہ ہوں جس سے گزرے بغیر مہدی موعود تک پہنچنا ممکن نہیں۔ ناصرالدین شاہ قاچار کا زمانہ تھا۔ اسے گرفتار کر کے علماء کی مجلس میں لایا گیا۔ مشہور ہے کہ اس نے بعض قرآنی آیات پڑھتے وقت اعراب میں غلطی کی اور لفظ سمٰوات کی غلطی جیسا کہ اقبال نے فرمایا ہے بہت واضح تھی۔ علماء اس پر تحقیراً مسکرائے۔ باب نے اپنی غلطی کی تعبیر یہ کی کہ میں نے قرآنی آیات کو اعراب کی قید سے آزاد

کردیا۔

باب کے معتقد اسے مخالفوں کی افسانہ طرازی قرار دیتے رہے۔ بظاہر اس قسم کی غلطی کا سرزد ہونا بعید از قیاس ہے۔ معمولی عربی دان بھی سمٰوات جیسے لفظ میں غلطی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ اغلب ہے یہ لفظ زبان سے ادا کرتے وقت ایسے طریق پر ادا ہوا ہو کہ اسے غلطی سمجھ لیا گیا۔

بہرحال باب کو کچھ مدت بعد موت کی سزا ملی۔ قرۃ العین زرّین تاج باب کی خاص مرید و معتقد اور اس کے مذہب کی بہت بڑی مبلّغ تھی۔ وہ بھی قتل ہوئی۔ پھر بہاء اللہ نے باب کے مذہب کی تبلیغ شروع کردی اور بابیوں کا لقب بہائی مشہور ہوا، لیکن بہاء اللہ کا مذہب باب سے مختلف تھا۔ عکّہ بہائیوں کا مشہور مرکز ہے۔

اعراب: لفظی معنی روشن کرنا۔ اصطلاح میں عربی حروف تہجّی کی حرکات یعنی فتحہ۔ کسرہ اور ضمّہ یا زبر، زیر، پیش۔

۱۔ بطور طنز فرماتے ہیں کہ علی محمّد باب نے علماء کی ایک مجلس میں خوب بات کہی اور عجیب نکتہ پیدا کیا۔ وہ بیچارہ قرآن پڑھتے وقت لفظ سمٰوات کے اعراب غلط پڑھ گیا۔

۲۔ اس غلطی پر علماء مسکرا دیے۔ علی محمّد باب نے یہ کیفیت دیکھی تو بولا: تم لوگوں کو میری بلند روحانی ترقی کے درجوں کا کوئی علم نہیں۔

۳۔ دیکھو قرآنی آیات اب تک اعراب کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھیں۔ خدا نے میری امامت کے صدقے انھیں زنجیروں سے آزاد کردیا۔

تقدیر

(ابلیس و یزداں)

اقبال نے خود تحریر فرمایا ہے کہ ابلیس اور ذاتِ باری تعالیٰ کی یہ گفتگو جس میں تقدیر کے مسئلے کی

حقیقت واضح کی گئی ہے۔ شیخ محی الدین ابن عربی کی کسی کتاب سے ماخوذ ہے۔

کن فکاں: لفظی معنی ہو جا، پس ہو گیا۔ اصطلاح میں مخلوقات، کائنات، دنیا۔ **استکبار:** تکبّر کرنا۔ اپنے آپ کو بڑا سمجھنا۔ یہ اشارہ قرآن مجید کی اس آیت کی طرف جس کے مطابق خدا نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کو سجدہ کریں۔ ابلیس کے سوا سب سجدے میں گر پڑے۔ ارشاد ہوتا ہے: ابیٰ واستکبر وکان من الکافرین۔ (ابلیس نے نہ مانا اور تکبّر کیا اور تھا وہ کافروں میں) **مشیّت:** خدا کی مرضی۔ خدا کا ارادہ۔ **حجّت:** دلیل۔ **دُود:** دھواں۔

ابلیس: (۱) اے کائنات کے مالک خدا! مجھے آدم سے کوئی دشمنی نہ تھی۔ جس کے باعث سجدہ نہ کیا۔ وہی آدم جو زمان و مکان کی قید میں پھنسا ہوا ہے۔ بھلا اس آدم سے دشمنی کی مجھے کیا ضرورت تھی۔ جو نزدیک اور دور، دیر اور جلدی کی قید میں الجھا ہوا ہے۔ ابلیس سجدہ نہ کرنے کی اصل وجہ آگے بتاتا ہے لیکن اس نے آدم پر طنز کا موقع ہاتھ سے نہیں دیا۔

۲- بار الٰہ! بھلا کیونکر ممکن تھا کہ میں تیرے حضور میں بڑائی اور تکبّر کا کوئی کلمہ زبان پر لاتا یا سجدے کے لیے تیرا حکم ماننے سے انکار کرتا۔ بس یہ سمجھتا ہوں کہ میرے لیے سجدہ کرنا تیری مرضی اور ارادے میں نہ تھا۔

یزداں: (۳) یہ سنتے ہی باری تعالیٰ کا ارشاد ہوا کہ ابلیس! ذرا یہ تو بتا کہ تجھ پر یہ بھید کب کھُلا؟ تو نے کب سمجھا کہ سجدہ میری مرضی اور ارادے میں نہ تھا؟ سجدے سے انکار کر چکنے کے بعد یا اس سے پہلے؟

ابلیس:۔ اے وہ پاک ذات! کہ ہستی کے تمام کمالات تیری تجلّی کا کرشمہ ہیں۔ یہ بھید مجھ پر انکار کے بعد آشکارا ہوا۔ پہلے آشکارا نہ تھا۔

یزداں: (۴) (فرشتوں کی طرف دیکھ کر) دیکھو یہ کہتا ہے کہ سجدہ میری مرضی اور ارادے میں نہ تھا یہ دلیل اسے پستیٔ فطرت نے سجھائی ہے۔ اگر اس کی فطرت پست نہ ہوتی تو حکم سنتے ہی اس کے سامنے سر جھکا دیتا لیکن اس نے اپنی آزادی کو مجبوری کا نام دے دیا۔ اپنے لپکتے ہوئے شعلے کو دھواں کہہ رہا ہے۔

آزادی اور مجبوری کے لیے شعلۂ سوزاں اور دُود سے بہتر تشبیہیں تلاش کرنا مشکل ہے۔ اس میں یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ ابلیس نے اپنی نافرمانی کے لیے تقدیر کو بہانہ بنایا۔ انکار سے پہلے اسے معلوم ہی نہ

تھا کہ خدا کی مشیّت کیا ہے۔ وہ آزاد تھا، مجبور نہ تھا۔ دانستہ اس نے انکار کیا اور یہ کہتے ہوئے کیا کہ میں آدم سے زیادہ بڑا ہوں۔ میں آگ سے پیدا ہوا ہوں، وہ مٹی سے۔ پھر میں اسے کیوں سجدہ کروں؟ انکار کے بعد وہ راندہ گیا تو یہ دلیل پیدا کر لی کہ سجدہ مشیّت ہی میں نہ تھا۔

اے رُوحِ محمّد صلی اللہ علیہ وسلّم

ملّتِ مرحوم: لفظی معنی وہ قوم جس پر رحم کیا گیا ہو۔ ملّتِ اسلامیہ۔ **شیرازہ:** وہ رشتہ جس سے کتابوں کی جلد بندی کی جاتی ہے۔ مُراد ہے نظم و انتظام سے۔ **آشوب:** طوفان۔ شورش۔ ہنگامہ۔ **راحلہ:** سواری **زاد:** توشہ۔ سفر کا سامان۔ **حُدی خوان:** حُدی اس نغمے کو کہتے ہیں جو ساربان اونٹوں کو تیز چلانے کے لیے گاتے ہیں۔ حُدی خوان۔ حُدی گانے والا۔

۱۔ ملّتِ اسلامیہ کا نظام ابتر ہو گیا۔ اے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوحِ پاک تو ہی بتا کہ اب مسلمان کس کا دامن پکڑے، کدھر جائے اور کیا کرے؟

۲۔ عرب کے سمندر میں طوفان، جوش اور ہنگامے کی کوئی لذّت باقی نہ رہی۔ میرے دل میں جو طوفان چھپا ہوا ہے وہ کہاں بپا ہو؟ کس سمندر کا رُخ کرے؟

۳۔ عرب کے پہاڑوں اور بیابانوں میں جو حدی خواں بیٹھے ہیں اگرچہ ان کے قافلے نہیں رہے۔ سواریاں بھی غائب ہو گئیں، سفر کا سامان بھی ان کے پاس نظر نہیں آتا، لیکن وہ ان پہاڑوں اور بیابانوں کو چھوڑ کر کہاں جائیں؟
مطلب یہ کہ نہ ان میں کوئی قومی تنظیم باقی رہی جیسی کہ قافلے میں ہوتی ہے۔ نہ ان کے پاس زندگی کا وہ سر و سامان نظر آتا ہے جو دوسری قوموں کو حاصل ہے۔ آخر وہ کیا کریں؟

۴۔ اے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رُوحِ پاک! میں تیرے سوا یہ راز کس سے پوچھوں کہ مسلمان جو خدا کی آیات کا نگہبان اور محافظ ہے، پریشانی کی اس حالت میں کس کے پاس جائے؟

مدنیّتِ اسلام

اساس : بنیاد   **افلاطون :** یونان کا مشہور فلسفی اور حکیم جس کے فلسفے کا خلاصہ یہ تھا کہ یہ دنیا خیالی ہے اور حقیقی دنیا کا محض ایک پرتو یا سایہ۔ حقیقی دنیا کو وہ عالم مثال قرار دیتا ہے۔ **عناصر :** عنصر کی جمع آگ۔ پانی۔ مٹی ہوا۔ یہاں مراد ہے ترکیبی اجزا۔ **رُوح القدس :** لفظی معنی پاک رُوح۔ مُراد حضرت جبریل (علیہ السلام)

۱۔ آ، میں تجھے بتاؤں کہ مسلمان کی زندگی کیا ہے؟ اس میں عقل بھی اوجِ کمال پر ہوتی ہے۔ اور عشق بھی۔ یعنی مسلمان کی زندگی میں عقل و عشق ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو اپنی اعلیٰ سے اعلیٰ صورت میں موجود ہوتے ہیں۔

۲۔ مسلمان سورج کی طرح زندگی بسر کرتا ہے۔ ایک جگہ ڈوبتا ہے تو دوسری جگہ جا نکلتا ہے۔ گویا اس کا طلوع و غروب یکساں ہے۔ مسلمان اپنی مثال آپ ہے اور زمانے کی طرح اس کے کئی رنگ ہیں یعنی جیسے گرد و پیش کے حالات ہوں مسلمان انھیں کے مطابق پیغامِ حق لے کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

۳۔ وہ حیادار ہوتا ہے اور موجودہ زمانے کی تہذیب کی طرح انسانیت کے اس پاکیزہ جوہر (حیا) سے بیزار نہیں ہوتا۔ نہ پرانے زمانے کی طرح افسانوں، قصّے کہانیوں اور جھاڑ منتر یا اوہام سے اسے کوئی تعلق ہوتا ہے۔

موجودہ زمانے کی تہذیب کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حیا کا عنصر سب سے کم ہے۔ بلکہ اس میں حیا سے بیزاری کا اظہار کیا جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں عموماً اوہام پر زندگی بسر ہوتی تھی۔ مسلمان کا دامن ایسے داغوں سے بالکل پاک ہے۔

۴۔ مسلمان کے تمدن کی بنیاد ایسی حقیقتوں پر ہے جو کبھی نہ بدلیں گی اور ہمیشہ قائم رہیں گی۔ یہ زندگی ایک حقیقت ہے۔ افلاطون کی طرح فکر و خیال کا طلسم نہیں، لہٰذا اس میں حقیقتوں پر بنیاد رکھے بغیر چارہ نہیں۔

۵۔ اب اسلامی تمدن کے بڑے بڑے اجزا کی حقیقت چند لفظوں میں سُن لیجیے۔ اس میں حضرت جبریل ؑ کا ذوقِ جمال ہوتا ہے، عجم کا حُسنِ طبیعت اور عرب کا سُوزِ دل۔

ذوقِ جمال سے مُراد ہے لطافت و پاکیزگی کا شوق۔ حُسنِ طبیعت سے مُراد ہے حُسنِ فکر، حُسنِ اخلاق اور نفاست پسندی۔ سُوزِ دل سے مُراد ہے گرم جوشی اور حرارتِ عشق۔

امامت

ملّتِ بیضا: مسلمان قوم۔ **سلاطین**: سلطان کی جمع۔ بادشاہ۔
پرستار: پجاری۔

۱۔ اے مخاطب! تونے مجھ سے پوچھا ہے کہ امامت کی حقیقت بیان کروں۔ سوال کے جواب سے پہلے میں دُعا کرتا ہوں کہ خدا نے جس طرح مجھ پر مختلف چیزوں کے بھید کھول دیے ہیں، اسی طرح یہ بھید تجھ پر بھی کھول دے تاکہ تو میرے جواب کو سمجھے اور اس سے فائدہ اٹھائے۔

۲۔ تیرے عہد کا سچّا امام وہی ہے، جو تجھے موجودہ زمانے کے حالات سے بیزار کردے۔ تیرے دل میں اسلامی ماحول کے لیے عشق و شیفتگی کی ایسی آگ لگا دے کہ تو موجودہ دور کو بدلے بغیر ایک دم بھی چین نہ لے۔

۳۔ وہ امامِ برحق تجھے موت کے آئینے میں محبوبِ حقیقی کا چہرہ دکھا دے اور ایسی لگن لگادے کہ جینا تیرے لیے اور بھی مشکل ہوجائے۔

۱۔ اس شعر کے پہلے مصرع میں جس موت کا ذکر ہے نظر بظاہر وہ شہادت کی موت ہے، جس کے متعلق قرآن شریف میں ارشاد ہوا ہے: ولا تحسبنّ الّذین قتلوا فی سبیل اللّٰہ امواتا بل احیاءٌ عند ربّھم یرزقون۔ (آلِ عمران) اور تو نہ سمجھ اُن لوگوں کو جو مارے گئے اللہ کی راہ میں مردے، بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے رب کے پاس کھاتے پیتے۔

۲۔ انّ اللّٰہ اشتری من المؤمنین انفسھم واموالھم بانّ لھم الجنّۃ یقاتلون فی سبیل اللّٰہ فیقتلون ویقتلون۔ (التوبہ) اللہ نے خرید لیے مسلمانوں سے ان کی جانیں اور ان کے

مال اس قیمت پر کہ ان کے لیے جنّت ہے ۔ لڑتے ہیں اللہ کی راہ میں پھر مارتے بھی ہیں اور مرتے بھی ہیں ۔

اقبالؔ کہتے ہیں کہ جو امام مسلمان کے دل میں محبوبِ حقیقی کے دیدار کا یقین پیدا کر کے اسے شہادت کی موت کا طلب گار بنا دے ، وہی سچّا امام ہے ۔

۴ ۔ سچے امام کا ایک نشان یہ ہے کہ اے مسلمان ! تیرے دل میں اس عظیم الشّان نقصان کا احساس پیدا کر دے جس کا نشانہ تو صدیوں سے بنا چلا آ رہا ہے ۔ نقصان کا احساس ہو جائے تو تیرا لہو گرما جائے گا اور تو نقصان کی تلافی کے لیے تیار ہو جائے گا ۔ امام برحق ہی تجھے درویشی کی سان پر چڑھا کر وہ تلوار بنا سکتا ہے ، جو باطل کی صفوں کو کاٹ کر رکھ دے ۔

گویا سچے امام کی یہ خصوصیتیں ہیں :

(۱) مسلمان کے دل میں موجودہ حالات سے بیزاری پیدا کر دے ۔

(۲) اسے شہادت کی موت کا شیدائی بنائے ۔

(۳) دل میں نقصان کا احساس پیدا کر کے لہو گرما دے ۔

(۴) مسلمان کو درویشی کی سان پر چڑھا کر جوہر دار تلوار بنا دے ۔

۵ ۔ جو شخص مسلمانوں کو بادشاہوں کا پجاری بناتا پھرے ، اس کی امامت مسلمان قوم کے لیے ایک فتنہ ، ایک مصیبت اور ایک آزمائش ہے ۔

فقر و راہبی

سکون پرستی : آرام طلبی ۔ **سفینہ** : کشتی ۔ **وانمود** : آشکارا کرنا ۔ **صیرفی** : کھوٹا کھرا پرکھنے والا صرّاف ۔ **طغیانی** : چڑھاؤ ۔ طوفان ۔ **سَلمانی** : سلمانؓ سے منسوب یعنی مشہور صحابی حضرت سلمانؓ فارسی ۔ **سُلیمانی** : حضرت سلیمان علیہ السّلام سے منسوب ۔ مشہور پیغمبر

۱۔ اگر تو درویشی اور ترکِ دنیا کو ایک چیز قرار دیتا ہے تو سمجھنا چاہیے کہ تو حقیقی اسلام کا پیرو نہیں۔ تیرا اسلام کچھ اور چیز ہے۔

رہبانی یعنی ترکِ دنیا کو اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سلسلہ ابتدائی دور کے عیسائیوں نے شروع کیا اور قرآن مجید نے سورۂ حدید میں صاف صاف واضح کر دیا کہ ترکِ دنیا عیسائیوں کی اپنی نکالی ہوئی بات ہے۔ ورھبانیۃ ابتدعوھا ما کتبنٰھا علیھم ـــ لہٰذا اسے اسلامی فقر اور درویشی کا ہم معنی قرار دینا سراسر غلط اور اسلامی تعلیم کے خلاف ہے۔

۲۔ سچا درویش دنیا کے تارک کی آرام طلبی اور گوشہ گیری سے سخت بیزار ہوتا ہے۔ وہ نہ آرام طلبی اور گوشہ گیری کو پسندیدہ سمجھ سکتا ہے اور نہ اسے اختیار کر سکتا ہے۔ اس کی کشتی تو ہمیشہ طوفانوں ہی میں رہنا پسند کرتی ہے۔ یعنی وہ تو ہمیشہ باطل سے ٹکر لے کر مصیبتوں اور آفتوں کے ہجوم میں وقت گزارتا ہے۔

۳۔ درویش کا خاصہ یہ ہے کہ اپنی رُوح اور اپنے بدن کو ہمیشہ میدانِ امتحان میں آشکار کرتا رہے۔ مومن کا کمال یہی ہے کہ اس کی خودی بے نقاب ہو جائے۔

۴۔ درویش کا وجود کائنات کے کھوٹے کھرے کو پرکھنے کی کسوٹی ہوتا ہے۔ اسی کو معلوم ہے کہ کون سی چیز باقی رہنے والی ہے اور کون سی فنا ہونے والی۔ یعنی وہ حق کو باطل سے اور نیکی کو بدی سے الگ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ کون سی شے اپنی نفع بخشی کے باعث قائم رہنی چاہیے اور کون سی شے کو نقصان رسانی کے باعث مٹا دینا چاہیے۔

۵۔ درویش ہی تجھے بتا سکتا ہے کہ جو کچھ نظر آ رہا ہے، یہ دنیا ہے یا فقط رنگ اور بو کے طوفان کا کرشمہ۔ یعنی درویش کی نظروں میں دنیا کی کسی شے کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی۔ وہ سب کو ٹھکرا کر صرف خدا کی رضا پوری کرنے میں لگ جاتا ہے۔

۶۔ جب سے مسلمانوں نے یہ درویشی کھو دی، ان میں حضرت سلمانؓ یا حضرت سلیمانؑ دونوں کی دولت چھن گئی۔ یعنی نہ تقوٰی اور پرہیزگاری رہی، نہ جاہ و جلال اور شان و شکوہ، نہ عدل و انصاف اور نہ حقیقت تک پہنچنے والی نورانی نظر۔

غزل

یوم النّشور: قیامت کا دن۔

۱۔ تیری زندگی کا سرمایہ یہ ہے کہ علم و ہنر میں مگن رہئے۔ میری زندگی کا سرمایہ ایک بے صبر اور بے قرار دل کے سوا کچھ نہیں۔ یعنی تو علم و ہنر پر نازاں ہے، میری دولت صرف عشقِ حق ہے۔

۲۔ عقل مندوں اور سوچ بچار کرنے والوں نے اپنی کرامت کیا دکھائی؟ یہ کہ ایسا فلسفہ پیدا کر لیا جس میں پیچ پر پیچ چلے آتے ہیں اور اس کے ذریعے سے حقیقت تک پہنچنے کی کوئی صورت نہیں۔ اہلِ ذکر کو دیکھو انھوں نے کیا کیا معجزے پیدا کیے۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ کا کوہِ طور پر پیغمبر بننا، فرعون جیسے جابر بادشاہ کو کلمۂ حق سنانا، مظلوم بنی اسرائیل کو اس کے پنجۂ جبر سے چھڑانا۔ گویا ان کے معجزوں سے قوموں اور ملکوں کی تقدیریں پلٹتی رہی ہیں۔

۳۔ اے مخاطب! میں نے مصلحت کی بنا پر تجھے مسلمان کہہ دیا، ورنہ اسلام کی کوئی خصوصیت تجھ میں نظر نہیں آتی مسلمان وہ تھے جن کے سانس قیامت کی گرمی اگلتے رہتے تھے۔ تو خود سوچ، تیرے سانس میں اس حرارت کا شمہ بھی موجود ہے؟

۴۔ میرا گریبان تو مدّت سے تار تار ہے تو ابھی تک ہوش میں ہے اور تجھ پر کچھ بھی اثر نہیں ہوا۔ اس میں میرے جنون کا کیا قصور ہے؟

مراد یہ ہے کہ میں مدت سے ملّت کے غم میں پریشان ہوں اور آہ و فریاد کر رہا ہوں۔ اگر اس آہ و فریاد کا اثر تجھ پر نہیں ہوا تو اس میں میرا کوئی گناہ نہیں۔

۵۔ فیضِ نظر حاصل کرنے کی طلب ہو تو بولنے میں جلدی نہ کر بلکہ چُپ رہ۔ اہلِ نظر کے روبرو بے ربط باتیں کہنا مناسب نہیں۔

۶۔ وہ قوم کبھی دنیا میں ذلیل و خوار نہیں ہو سکتی جس کا عشقِ حق بیباک اور درویشی باغیرت ہو۔

تسلیم و رضا

ظلمت کدہ: اندھیرا گھر۔

۱۔ پودوں کو دیکھو، ان میں شاخیں کس طرح فضا میں پھیلتی رہتی ہیں۔ گویا ہر شاخ زبانِ حال سے یہ پیچ دار نکتہ واضح کرتی رہتی ہے کہ پودوں کو فضا کی کشادگی اور وسعت کا احساس ہے۔ اگر یہ احساس نہ ہوتا تو وہ ہر طرف کیوں پھیلتے؟

۲۔ اور دیکھو، دانے کو مٹی کے اندھیرے گھر میں ڈال دیا جاتا ہے، لیکن وہ وہاں رہنا پسند نہیں کرتا بلکہ ہر لحظہ اسے یہی خیال رہتا ہے کہ نشوونما پا کر زمین سے باہر نکل آئے۔ گویا اسے بھی فضا کے کشادہ ہونے کا احساس ہے۔

۳۔ نباتات کے ان طور طریقوں سے تو بھی سبق حاصل کر۔ فطرت کے جو تقاضے ہیں ان کی راہِ عمل کیوں روک سکتا ہے؟ انھیں بے تکلف پورا ہونے دے تو اپنے آپ کو تسلیم و رضا کا پابند بناتا ہے۔ کیا تسلیم و رضا کا مطلب یہ ہے کہ نشوونما کے فطری تقاضوں کو دبایا جائے؟ ہرگز نہیں۔ تسلیم و رضا کا مقصد اور ہے۔

۴۔ اگر تجھ میں نشوونما اور پھیلاؤ کی ہمت ہے تو خوب پھیل۔ فضا تیرے لیے تنگ نہیں۔ خدا کے بندے خدا کا ملک بہت وسیع ہے۔

نظم کا ماحصل یہ ہے کہ انسان کو اپنی طبعی اور فطری قوتوں سے انتہائی حد تک کام لینا چاہیے اور اپنی طرف سے کوئی کسر اٹھا نہ رکھنی چاہیے۔ اس کے بعد نتیجہ خدا کے فضل و کرم پر چھوڑ دینا چاہیے۔ اگر انسان کا عمل خدا کی رضا کے عین مطابق ہو تو وہ خدا کے بھروسے پر مسلسل جدوجہد کرتا جائے۔ خدانخواستہ نتیجہ خلاف بھی ہو تو اس پر صبر کرے اور اپنی قوتِ عمل کو افسردہ نہ ہونے دے۔ تسلیم و رضا کا مفہوم یہی ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

نکتۂ توحید

۱۔ نکتۂ توحید بیان کرنا مشکل نہیں، لیکن مصیبت یہ ہے کہ تیرا دماغ طرح طرح کے بتوں سے آراستہ ہے اور اسے بُت خانہ ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ پھر ایسے دماغ میں توحید کا نکتہ کیونکر سما سکتا ہے؟

مُراد یہ ہے کہ تو نے دنیوی مال و دولت اور عزّت وجاہ کے بُت دماغ میں قائم کر رکھے ہیں، ان کے ہوتے ہوئے تو توحید کی حقیقت سے کیوں کر واقف ہو سکتا ہے؟

۲۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یعنی کلمۂ توحید میں شوق کا جو بھید چھپا ہوا ہے، اُسے بیان تو کیا جا سکتا ہے، لیکن اگر اس کے لیے فقیہوں کا سا انداز اختیار کیا جائے تو وہ کیونکر سمجھ میں آئے گا؟

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے۔ توحید ہی ہے جس کی بدولت انسان کے لیے اشرف المخلوقات بننے کا راستہ کھُلا یعنی وہ خدا کو ایک ماننے کے بعد انسان اس کائنات کی تمام چیزوں سے ارفع و اعلیٰ بن گیا۔ وہ کسی کے بھی سامنے نہیں جھکے گا۔ اس لیے کہ خدا کے سوا نہ کوئی عبادت کے لائق ہے، نہ کوئی محافظ و رزّاق ہے، نہ مالک و مختار ہے۔ جب انسان کائنات کو اس نقطۂ نگاہ سے دیکھتا ہے کہ خدا نے یہ تمام چیزیں انسان کے لیے پیدا کیں۔ سُورج اسے روشنی اور حرارت پہنچاتا ہے اس روشنی میں انسان دن بھر محنت و مشقّت کرتا ہے۔ محنت کے بعد آرام چاہیے۔ خدا نے رات آرام کے لیے بنا دی۔ اس میں چاند اور تاروں کے چراغ روشن کر دیے جو گھپ اندھیرے کی خوفناکی دُور کرتے ہیں۔ اور انسان کے آرام میں کوئی خلل نہیں پڑتا۔ پھر درخت، پہاڑ، دریا، ندیاں، مویشی وغیرہ سب چیزیں انسان کے فائدے کے لیے بنائیں۔ یہ نعمتیں دیکھ کر انسان کے قلب میں مالکِ حقیقی کے شکر اور محبّت کا بے پناہ جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ یہی رمزِ شوق ہے جو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ میں پوشیدہ ہے، لیکن اسے واضح کرنے کے لیے فقیہوں کا سا طریقہ کیوں کر کام دے سکتا ہے؟

۳۔ حق اور باطل کی جنگ میں جو سرور، لذّت اور لطف ہے، اسے کیا بیان کیا جائے؟ بیان بھی کیا جائے تو اسے کون سمجھے گا جو رزم و پیکار سے بالکل بیگانہ ہے؟

۴۔ خدا کا سچا آزاد بندہ اس دنیا میں جو کچھ دیکھتا اور تجربہ کرتا ہے، وہ اگر تیرے سامنے بیان بھی کیا جائے تو کس امید پر؟ تیری تو نظر ہی غلامی میں ڈوبی ہوئی ہے۔ تو مردِ حق کے مشاہدات سے کیا لذت حاصل کرے گا؟

۵ درویشی کا مقام اور مرتبہ بادشاہی سے بہت بلند ہے، لیکن جس شخص نے بھکاری کے طور طریقے اختیار کر رکھے ہوں، وہ اس فرق کو کیونکر ذہن نشین کر سکتا ہے؟

الہام اور آزادی

مہمیز: لوہے کا کانٹا جو گھڑ سواروں کی ایڑی میں لگا ہوتا ہے۔ ایڑ۔

۱۔ خدا کے جس آزاد بندے کو الہام کا شرف حاصل ہو جائے، اس کی نگاہ انسانوں کی قوتِ فکر و عمل کے لیے ایڑ کا کام دیتی ہے۔ یعنی فکر و عمل میں نیا ولولہ اور نیا جوش پیدا ہو جاتا ہے۔

۲۔ اس کے سانس کی حرارت میں ایسا اثر ہوتا ہے کہ باغ کی مٹی سے بھی شعلے اُٹھنے لگتے ہیں۔ یعنی آرام دوست اور راحت طلب دلوں میں بھی عشقِ حق کی آگ بھڑک اٹھتی ہے۔

۳۔ بلبلیں شہبازوں کے طور طریقے اختیار کر لیتی ہیں۔ صبح کے وقت گانے والے پرندوں کی خصوصیتیں کس قدر بدل جاتی ہیں۔

۴۔ یہ مردِ حق اپنی حقیقت سے آگاہ ہوتا ہے اور ہر لحظہ خدا کے عشق میں مست رہتا ہے۔ اس کی صحبت میں بیٹھنے سے بھکاریوں کو جمشید اور پرویز جیسے شہنشاہوں کی شان و شوکت حاصل ہو جاتی ہے۔

۵۔ باقی رہا محکوم اور غلام کا الہام تو سب کو یہی دعا کرنی چاہیے کہ خدا اس سے بچائے۔ وہ چنگیز کی طرح قوموں کا سرمایۂ ایمان لوٹتا ہے اور انھیں برباد کر ڈالتا ہے۔

جان و تن

پیچاک: لفظی معنی پیچ و خم، مراد الجھن۔ عقدہ۔ **ارتباط:** ربط۔ تعلق۔ میل جول۔ **اختلاط:** خلط ملط ملنا۔ میل جول۔ **اخگر:** انگارہ۔

۱۔ انسان کی عقل زمانۂ دراز سے اس عقدے میں الجھی ہوئی ہے کہ رُوح کی اصل کیا ہے اور سیاہ مٹی یعنی انسانی جسم یا مادّہ پہلے پہل کس طرح ظہور میں آیا؟

۲۔ میں اس نکتے پر غور و فکر کر رہا ہوں کہ انسان کے دل و دماغ پر مستی، شور، سرور، درد اور داغ کی جو مختلف رُوحانی کیفیتیں طاری ہوتی ہیں۔ ان کی اصلیت کیا ہے؟ اور اے مخاطب! تو کہ سراپا مادّہ پرستی کے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔ اس مشکل مسئلے کو حل کرنے میں اپنی تمام ذہنی قوتیں صرف کر رہا ہے کہ شراب سے پیالہ بنا رہا ہے یا شراب پیالے سے بنی ہے۔ یعنی مادّہ روح سے بنا ہے یا رُوح مادّے سے بنی ہے؟

۳۔ حرف و معنی میں کیا تعلق اور جوڑ میل ہے؟ جان و تن کس طرح باہم گھل مل گئے ہیں؟ دونوں سوالوں کا جواب یہ ہے کہ اسی طرح جس طرح انگارا اپنی راکھ کا لباس پہن لیتا ہے۔

مثال کا مطلب یہ ہے کہ انگارے کو آگ سے الگ رکھ دیا جائے تو آہستہ آہستہ اس کا بالائی حصّہ راکھ بنتا جائے گا۔ اس کے اندر آگ اُس وقت تک قائم رہے گی جب تک پورا انگارا راکھ نہ بن جائے۔ اس سے ثابت ہوا کہ آگ اور راکھ کی اصل ایک ہے۔ اگرچہ ان کی شکلیں مختلف ہیں۔ اسی طرح جان و تن دونوں کی اصل ایک ہے۔ رُوح اور مادّے کو بہ اعتبارِ اصل الگ الگ نہیں کہہ سکتے۔ البتّہ اس کی شکلیں مختلف ہو گئیں۔ جب اصل ایک ہے تو پھر ان کا آپس میں گھل مل جانا تعجّب کا باعث کیوں ہو؟

نفسیات کی کوئی بھی کتاب دیکھ لی جائے۔ اس میں نفس اور جسم کے باہمی تعلق کی بحث ضرور ملے گی اقبال نے نظم کے پہلے مصرع میں غالباً اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ فلسفیوں کے نزدیک یہ بہت ہی پرانا

مسلمہ ہے۔ اقبال روح اور مادّے کی اصل ایک مانتے ہیں۔

لاہور و کراچی

اس نظم میں لاہور اور کراچی کے دو اہم واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ آریہ سماجیوں نے غالباً کسی سکیم کے ماتحت ایسی کتابیں چھاپی تھیں، جن میں مسلمانوں کے آقا و مولا حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات کے متعلق نہایت ناگوار انداز میں ذکر کیا گیا تھا۔ ان کتابوں میں سے لاہور کے ایک آریہ سماجی راج پال کی کتاب نے خاصی شہرت پائی۔ اس کے خلاف مقدمہ بھی چلا، لیکن راج پال کو ہائی کورٹ کے جج کنور دلیپ سنگھ نے بری کر دیا۔ پھر پے در پے ایسے مضامین، رسالے اور کتابیں چھپنے لگیں جو مسلمانوں کے لیے حد درجہ رنج افزا تھیں۔ ان میں سے رسالہ "ورتمان" کا مطالعہ خاص طور پر قابل ذکر ہے، جس کے خلاف سرکار نے مقدمہ چلایا تھا۔ سر محمد شفیع مرحوم نے سرکار کی طرف سے مقدمے کی پیروی کی تھی اور "ورتمان" کے ایڈیٹر کو سزا ہو گئی تھی۔ لیکن اصل سلسلہ نہ رکا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان نوجوان آپے سے باہر ہو گئے۔ لاہور میں ایک بڑھئی کے اَن پڑھ بیٹے علم الدین نے دن کے وقت راج پال کی دکان میں جا کر اسے قتل کر دیا۔ میانوالی جیل میں اسے پھانسی کی سزا دی گئی۔ اس کی میت لاہور لانے کے لیے ایک ہمہ گیر تحریک شروع ہو گئی۔ حکومت نے میت لانے کی اجازت دے دی۔ چو برجی کے میدان میں جس شان سے اس مرحوم کی نماز جنازہ ادا کی گئی، اس کی مثال ماضی قریب کی تاریخ میں نہیں مل سکتی۔ دُور دُور سے لاکھوں آدمی اس موقع پر لاہور پہنچے اور علم الدین کی قبر زمانہ دراز تک زیارت گاہِ عوام بنی رہی اور آج بھی ہے۔

اسی طرح سرحد کے ایک پٹھان عبدالقیوم خاں نے کراچی میں اسی قماش کے ایک ہندو ناجر کتب کو قتل کر دیا۔ اسے بھی پھانسی کی سزا ملی۔ کلکتہ میں بھی ایک ہندو نے ایسی ہی کتاب چھاپی تھی۔ لاہور سے تین نوجوان کلکتہ پہنچے۔ ان میں سے عبداللہ خاں نے اس ہندو کو قتل کر دیا۔

اِن واقعات میں سے پہلے دو کا ذکر اقبالؔ نے اس نظم میں کیا ہے۔ تیسرا واقعہ غالباً اس وجہ سے زیادہ شہرت نہ پاسکا کہ وہ ایک دور افتادہ مقام پر پیش آیا تھا اور ان نوجوانوں کے کارنامے کا علم ملک کے تمام مسلمانوں کو نہ ہو سکا۔

دیت : خوں بہا۔ خون کی قیمت۔ **اہلِ کلیسا :** یہاں مراد ہے انگریز۔

لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَر۔ اشارہ ہے سورۂ عنکبوت کی آخری آیت کی طرف۔

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ۔ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ۔ کُلُّ شَیْءٍ ھَالِکٌ اِلَّا وَجْھَہٗ لَہُ الْحُکْمُ وَاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ۔

اور مت پکار اللہ کے سوا دوسرا حاکم۔ کسی کی بندگی نہیں اس کے سوا۔ ہر چیز فنا ہے مگر اس کی ذات۔ اسی کا حکم ہے اور اسی کی طرف پھر جاؤ گے۔

۱۔ غیرت مند مسلمان صرف اللہ پر نظر رکھتا ہے۔ جو کچھ مانگتا ہے اسی سے مانگتا ہے۔ اس کے لیے موت سے ڈرنے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ اس کے لیے تو موت کا مطلب یہ ہے کہ اس مادّی دنیا سے اٹھ کر روحانی دنیا میں چلا جائے۔ جس کی طلب ہر صاحبِ ایمان کو ہر وقت ہونی چاہیے۔

۲۔ یہ ہمارے شہید جنھوں نے میانوالی اور کراچی میں رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس کی خاطر پھانسی کی سزا پائی، ان کا خوں بہا انگریزی حکومت سے نہ مانگ۔ ان شہیدوں کا خون تو قدر و قیمت میں کعبے سے بھی بڑھا ہوا ہے۔

شعر کے دوسرے مصرع میں غالباً حدیث قدسی کی طرف اشارہ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کعبے کا طواف کر رہے تھے۔ یکایک ٹھہر گئے اور کعبے کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: تو اس دنیا میں اللہ کو سب سے پیارا ہے، لیکن ایک مسلمان کا خون تجھ سے بھی زیادہ پیارا ہے۔ جن مسلمانوں نے ناموسِ رسولؐ کی خاطر شہادت پائی، ان کا خون یقیناً بہت زیادہ قیمتی ہونا چاہیے۔

۳۔ اے مسلمان! کیا تجھے قرآنِ حکیم کا یہ ارشاد یاد نہیں کہ مت پکار اللہ کے سوا دوسرا حاکم۔ جب خدا کے سوا کسی کو پکارنا درست نہیں تو شہیدوں کے خون کی قیمت کیوں کسی سے مانگی جائے؟

نبوّت

برگِ حشیش: بھنگ کی پتّی۔ نشہ آور۔

۱۔ مجھے نہ معرفت کا مقام حاصل ہے۔ نہ مجدّد ہوں یعنی نہ دین کو تازہ کیا ہے، نہ میں حدیث کا بہت بڑا عالم ہوں اور نہ فقہ کا اس لیے مجھے معلوم نہیں کہ نبوّت کے مقام اور کمالات کی کیا حیثیت ہے؟ یہ حیثیت عارفوں، مجدّدوں، محدّثوں یا فقیہوں ہی معلوم ہو سکتی ہے۔

۲۔ البتّہ دنیائے اسلام کے حالات سے پوری طرح واقف ہوں اور آسمان کے ضمیر میں جو کچھ ہے وہ مجھ پر آشکار ہے۔

۳۔ موجودہ زمانے کی حیثیت ایک اندھیری رات کی ہے۔ اس اندھیری رات میں، میں نے مندرجۂ ذیل حقیقت اسی طرح روشن دیکھی ہے، جیسے چاند روشن ہوتا ہے۔

۴۔ جس نبوّت میں مسلمانوں کے لیے قوّت و طاقت اور شان و شوکت کا پیغام نہ ہو، اسے ملّتِ اسلامیہ کے لیے بھنگ کی پتّی سمجھنا چاہیے، جیسے گھوٹ کر پی لینے سے انسان پر بیہوشی سی طاری ہو جاتی ہے اور اس کے اعضا کام کے نہیں رہتے۔

ممکن ہے برگِ حشیش سے اشارہ حسن بن صبّاح کے طریقے کی طرف ہو۔ جس نے اپنے مرکز کے پاس جنّت کے نمونے کا ایک باغ بنایا تھا۔ لوگوں کو بھنگ پلا کر بے ہوش کرتا اور اس باغ میں پہنچا دیتا۔ وہ دو چار روز وہاں بسر کرتے۔ پھر بھنگ پلا کر انھیں باہر لایا جاتا اور کہہ دیا جاتا کہ فلاں آدمی کو قتل کر دو گے تو تمھیں اسی جنّت میں پہنچا دیا جائے گا۔ جہاں ہمیشہ رہو گے۔ اسی طرح اس نے فدائیوں کی ایک بڑی جماعت تیار کر لی تھی اور اس کا یہ نظام لمبی مدّت تک دنیائے اسلام کے لیے مصیبت کا سامان بنا رہا۔

آدم

۱ - یہ بود و عدم، بقا و فنا، ہونے کا طلسم جسے انسان کہتے ہیں، خدا کا ایسا بھید ہے کہ اسے بیان کا لباس نہیں پہنایا جا سکتا۔ یعنی اس بھید کو بیان کرنا ممکن نہیں۔

۲ - زمانہ کائنات کی پیدائش کے آغاز سے گرمِ سفر ہے، مگر اُس کی تگ و دو اور بھاگ دوڑ انسان کو پرانا اور فرسودہ نہیں بنا سکی۔ وہ اب بھی اسی طرح نیا اور تازہ ہے جس طرح ابتدا میں ہو گا۔

مراد یہ ہے کہ زمانہ جب سے وجود میں آیا ہے۔ انسان بھی اسی وقت سے چلا آتا ہے اور آج تک اس پر کہنگی کی کوئی کیفیت طاری نہیں ہوتی۔ یعنی وہ ہر لحظہ نئے خیالات، نئے افکار، نئے طور طریقے پیدا کر لیتا ہے۔ اس طرح اپنے آپ کو پُرانا نہیں ہونے دیتا۔

۳ - اگر تجھے میری اس بات سے الجھن پیدا نہ ہو تو کھول کر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ انسان کا وجود نہ رُوح ہے نہ بدن، یعنی اسے رُوح بھی نہیں کہہ سکتے اور بدن بھی نہیں کہہ سکتے۔ یہ کچھ اور ہی شے ہے۔

مکّہ اور جنیوا

پہلی جنگ یورپ کے بعد فاتح قوموں نے جمعیت اقوام (لیگ آف نیشنز) کی بنیاد رکھی تھی۔ اس کا مقصد یہ بتایا گیا تھا کہ تمام قومیں آپس میں مل جل کر رہیں اور اگر ان میں سے دو یا زیادہ قوموں میں جھگڑا پیدا ہو تو باقی قومیں بیچ بچاؤ سے صلح کرا دیں، لیکن اصل میں یہ ایک ڈھونگ تھا، جو فاتح قوموں نے اس غرض سے کھڑا کر لیا تھا کہ اپنے مقاصد بہ آسانی پورے کر سکیں۔ اقبال نے اس کے متعلق "پیامِ مشرق" میں لکھا تھا کہ:

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہرِ تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

یعنی جمعیت اقوام کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں کہ چند کفن چور آپس میں مل بیٹھے ہیں اور ان کی غرض یہ ہے کہ ایک دوسرے سے لڑنے کے بجائے قبریں بانٹ لیں اور اپنے اپنے حلقے سے کفن چراتے رہیں۔

اس جمعیت اقوام کا مرکز جنیوا تھا جو سوئٹزرلینڈ کا مشہور شہر ہے، لہٰذا اقبال نے اسلام کے لیے مکّہ اور فرنگی جمعیتِ اقوام کے لیے جنیوا تجویز کیا۔

فرنگی جمعیت اقوام کے بارے میں اقبال کی رائے کبھی اچھی نہ ہوئی۔ ایک موقع پر وہ اس بات کیلئے مضطرب تھے کہ مسلمان اپنی ایک جداگانہ جمعیت بنالیں اور اس طرح اپنے اندر عمل کی وحدت پیدا کرلیں۔ پیش نظر نظم میں انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا ہے کہ اسلام انسانوں میں وحدت پیدا کرنے کے لیے آیا تھا۔

ملل : ملّت کی جمع۔ قومیں۔

۱۔ اگرچہ موجودہ زمانے میں قوموں کے درمیان عام میل جول پیدا ہوگیا، لیکن انسان کی وحدت سب کی نگاہوں سے چھپی رہی، یعنی جمعیت اقوام بنانے والوں کو یہ حقیقت معلوم نہ ہوئی کہ اصل مقصود مختلف قوموں کو ملانا نہیں بلکہ انسانوں کے درمیان وحدت پیدا کرنا ہے۔

۲۔ اہلِ یورپ نے جو جمعیت اقوام بنائی ہے، اس کا مقصود یہ ہے کہ حُسنِ تدبیر سے قوموں اور ملتوں میں تفرقہ ڈالا جائے اور انھیں ایک دوسری سے الگ الگ کر دیا جائے۔ اسلام کا مقصود صرف یہ تھا کہ پوری انسانی دنیا ایک رشتے میں پروئی جائے اور متحد ہو جائے۔

۳۔ مکّہ معظمہ نے جنیوا کی سرزمین کو یہ پیغام دیا کہ تمھارے ہاں قوموں کی جو جمعیت بنی ہوئی ہے۔ یہ اصل مقصود نہیں، اصل مقصود یہ ہے کہ انسانوں کو اکٹھا کر کے ان میں برادرانہ میل جول بڑھایا جائے۔

اے پیرِ حرم

خودشکنی: لفظی معنی اپنے آپ کو توڑنا۔ مراد یہ ہے کہ انسان کبر و غرور سے پاک ہو جائے اور اپنے آپ کو شریعت کا پابند بنالے۔ **خودنگری:** اپنے آپ کو دیکھنا۔ یعنی اپنی حقیقت پہچاننا۔ **خاراشگافی:** سخت پتھر میں سوراخ کرنا۔ **آشفتہ سری:** لفظی معنی پریشان خیالی اور جنون۔ یہاں وہ جنون مراد ہے جو کمال عشق و شیفتگی کا نتیجہ ہو۔

۱۔ اے حرم کے پیر یعنی اے مسلمانوں کے رہنماؤ! خواہ وہ عالم ہوں یا صوفی، آپ حضرات کو خانقاہوں کے طور طریقے چھوڑ دینے چاہییں اور میری زبان سے صبح کے وقت جو نوائیں نکل رہی ہیں، ان کا مقصد سمجھنا چاہیے۔ یعنی میں شعروں میں جو حقیقتیں بیان کر رہا ہوں، وہ خاص غور و فکر کی محتاج ہیں۔

۲۔ جن نوجوانوں کی رہنمائی خدا نے آپ کو عطا کر رکھی ہے، میری دعا ہے کہ وہ سلامت رہیں۔ آپ حضرات کو چاہیے کہ انھیں خودشکنی اور خودنگری کا سبق دیں، یعنی وہ آوارگی اور خود رائی چھوڑ دیں، کبر و غرور سے کنارہ کشی اختیار کر لیں، اپنے آپ کو پابند شریعت بنائیں، اپنا بلند مقام پہچانیں اور اپنی گراں بہا ذمہ داریوں کو محسوس کریں۔

۳۔ یورپی تہذیب نے انھیں شیشہ گری کا فن سکھا دیا، یعنی ان میں عیاری و مکاری آگئی اور روح اخلاص باقی نہ رہی۔ آپ انھیں سخت پتھروں میں سوراخ کرنے کے طریقے سکھائیں۔

شیشہ گری کے مقابلے میں خاراشگافی سکھانے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے نوجوان فرنگیوں کی جاری کی ہوئی درس گاہوں اور ان کی تہذیب کی آغوش میں تربیت پا کر بہت نرم اور آرام طلب بن گئے ہیں۔ ان کے مزاج شیشے کی طرح نازک ہیں کہ ذرا ٹھیس لگے تو ٹوٹ جائے، حالانکہ انھیں حد درجہ جفاکش، محنتی اور سخت کوش ہونا چاہیے۔

۴۔ دو صدیوں کی غلامی نے ان کا دل توڑ دیا اور ان کی نگاہوں میں پریشانی پیدا ہو چکی ہے۔ یعنی ان کے سامنے نہ پختہ مقاصد ہیں اور نہ ان کے لیے استقلال سے کوشش کر سکتے ہیں۔ اس پریشانی کا علاج ہونا چاہیے۔

۵۔ آخری شعر میں نظر بظاہر خدا سے خطاب ہے۔ کہتے ہیں کہ میں تیرے عشق کے جوش میں تیرے بھید ظاہر کرجاتا ہوں۔ مجھے بھی اس عشق و شیفتگی کا صلہ اور انعام عطا ہو۔

مہدی

مجذوب: فرنگستان کا دیوانہ۔ مُراد ہے جرمنی کے مشہور فلسفی نیٹشے سے جس نے جرمنوں کے لیے فوق البشر (SUPERMAN) کا تخیل پیدا کیا اور انہیں قوت و طاقت کے دیوانے بنا دیا۔ فوق البشر سے وہ انسان مراد ہے جو عام انسانوں سے بہت بالاتر ہو۔ اس کی قوتوں اور طاقتوں کا کوئی اندازہ نہ کیا جا سکے۔

ختن: وسطی ایشیا کا ایک خطہ جہاں کے مُشک والے ہرن بہت مشہور ہیں۔

۱۔ قوموں کی زندگی ان کے نصب العین پر موقوف ہے۔ جیسا کہ نصب العین ہوگا، اسی کے سانچے میں قوم کی زندگی ڈھل جائے گی۔

۲۔ یورپ کے مجذوب نیٹشے نے یورپ کے انداز کے مطابق مہدی کا تخیل پیدا کیا اور اس تخیل سے اپنے وطن میں زندگی کی تازہ روح پھونک دی۔

ہم اوپر بتا چکے ہیں کہ نیٹشے نے فوق البشر کا تصور پیش کیا اور جرمنوں کے دل میں یہ لَو لگائی کہ وہ انتہائی قوّت و طاقت کے مالک بن کر ساری دنیا پر چھا جائیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ یہ مہدی ہی کا تخیل تھا جس نے یورپی علوم کے سانچے میں ڈھل کر فوق البشر کی صورت اختیار کر لی۔

۳۔ اے مخاطب! تو کیوں مہدی کے تخیل سے بیزار ہے؟ یہ تخیّل تو قوم کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے، جو خطّۂ ختن کے لیے مُشک والے ہرنوں کی ہے۔ تو ختن کو کیوں مُشک والے ہرنوں سے محروم کرتا ہے؟

۴۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ محض تخیّل اور نصب العین سامنے رکھ لے، پھر ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھا رہے بلکہ تجھے زبردست جدوجہد جاری رکھنی چاہیے۔ اس لیے کہ تو زندہ ہے، مرا نہیں اور زندگی جب تک باقی ہے، یہ جدوجہد ترک کرنا حرام ہے۔ اگر کوئی زندہ آدمی کفن پہن کر لیٹ جائے تو کیا اُسے مردہ سمجھ لینا مناسب

ہوگا یا یہ ضروری ہوگا کہ اس بے سمجھ سکے کفن کو تار تار کر کے رکھ دیں؟

مردِ مسلمان

برہان: حجت۔ نشان۔ **قہاری:** قہر جس سے دشمن کانپ اٹھیں۔ **غفاری:** بخشش۔ خطا کاروں سے درگزر۔ **قدوسی:** پاکیزگی۔ مراد ہے سیرت و کردار کی پاکیزگی۔ **جبروت:** عظمت و بزرگی، یعنی سب پر فائق ہونا اور کسی کی محکومی قبول نہ کرنا۔ **قاری:** قرآن پڑھنے والا۔

۱۔ مومن کی شان اور آن ہر لحظہ نئی ہوتی ہے۔ وہ بات چیت اور عمل میں خدائے تعالیٰ کا ایک نشان ہوتا ہے۔

۲۔ جس طرح یہ کائنات چار عنصروں یعنی آگ، پانی، مٹی، ہوا سے بنی ہے، اسی طرح مسلمان بھی چار ہی عنصروں سے بنتا ہے۔ یعنی:

ا۔ اس کے زور و قوت کا یہ عالم ہو کہ دشمنوں پر لرزہ طاری ہو جاتے۔

ب۔ غلبہ حاصل کر چکنے کے بعد اس کا عفو و درگزر ایسا ہو کہ خطا کاروں کے دل اس کی طرف بے اختیار مائل ہو جائیں۔

ج۔ سیرت اور کردار میں وہ حد درجہ پاکیزہ ہو۔

د۔ عظمت و برتری میں سب سے زیادہ بڑھا ہوا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پاک کے متعلق مولانا ابوالکلام آزادؒ نے "ترجمان القرآن" میں جو کچھ چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے، وہ بھی قابل توجہ ہے۔ فرماتے ہیں:

> مظلومی میں صبر، مقابلے میں عزم، معاملے میں راست بازی، طاقت و اختیار میں درگزر تاریخ انسانیت کے وہ نوادر ہیں، جو کسی ایک زندگی کے اندر اس طرح کبھی جمع نہ ہوتے۔ (جس طرح رسولِ پاکؐ میں جمع ہوئے۔)

۳۔ مسلمان اگرچہ خاک سے پیدا ہوتا ہے، لیکن حُسنِ عمل کی وجہ سے جبریل امینؑ کا ہمسایہ بن جاتا ہے وہ جغرافیائی

وطنیت کے جال میں کبھی نہیں پھنسا۔ وطن کی خدمت ضرور کرتا ہے، لیکن اہلِ یورپ کی طرح اسے قومیت کی بنیاد نہیں بناتا۔ اس لحاظ سے نہ بخارا کو اس کا وطن کہہ سکتے ہیں، نہ بدخشاں کو۔

۴۔ یہ بھید کسی کو معلوم نہیں کہ صاحبِ ایمان اگرچہ قرآن پڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن در اصل وہ خود قرآن ہوتا ہے۔ یعنی وہ قرآن کی ایک ایک چیز پر مضبوطی سے کاربند ہو جاتا ہے۔ گویا قرآن کا عملی نمونہ بن جاتا ہے۔

۵۔ اس کے ارادے قدرت کے مقاصد کی کسوٹی ہوتے ہیں، یعنی قدرت جو کچھ چاہتی ہے، مومن اسی کو لباسِ عمل پہناتا ہے۔ وہ دنیا میں بھی خدا کی ترازو ہوتا ہے اور قیامت میں بھی خدا کی ترازو ہوگا۔ گویا صاحبِ ایمان دنیا میں بھی نیکی کو بدی سے الگ کرتا ہے، قیامت میں بھی وہی نیک و بد کا معیار ہوگا۔

۶۔ جہاں نرمی اور ملائمت کی ضرورت ہو، مومن وہ شبنم ہوتا ہے، جس سے لالے کے جگر میں ٹھنڈک پیدا ہو جائے جہاں باطل کے مقابلے کا موقع پیش آ جائے، وہ ایسا طوفان بن جاتا ہے جس سے دریاؤں کے دل لرز جائیں۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ مومن خویشوں کے ساتھ حد درجہ نرم اور دشمنوں کے ساتھ حد درجہ سخت ہوتا ہے۔

۷۔ مسلمانوں کی زندگی میں فطرت کے نغموں کی دلآویزی اور سرور پایا جاتا ہے۔ ان نغموں کے سُر تال میں وہی ہم آہنگی و ہم آوازی ہے جو سورۂ رحمٰن کی ممتاز خصوصیت مانی جاتی ہے۔

قرآن مجید یوں تو پورے کا پورا معنویت کے علاوہ بیان کے لحاظ سے بھی ایک معجزہ ہے۔ لیکن سورۂ رحمٰن کے الفاظ میں جو ایک خاص قسم کا ترنّم ہے اس کی وجہ سے یہ سورت پڑھنے میں حد درجہ دلآویز معلوم ہوتی ہے۔ کوئی آدمی سمجھے بغیر بھی اسے اچھّے لہجے میں پڑھے تو سننے والے پر وجد کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مومن کے شب و روز میں خاص دل آویزی پائی جاتی ہے۔

۸۔ میرے فکر و خیال کے کارخانے میں ستارے بن رہے ہیں تو ان میں سے اپنی قسمت کا ستارا چن لے۔

مُراد یہ ہے کہ میں اپنے شعروں میں زندگی کے حقائق و معارف بیان کر رہا ہوں۔ جو ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں تو بھی اپنی بساط کے موافق ان سے فائدہ اٹھا۔

پنجابی مُسلمان!

تاویل: لفظی معنی کسی لفظ کو ظاہر سے پھیر دینا۔ اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہے کہ کم یا زیادہ مناسبت کے لحاظ سے کسی لفظ، فقرے وغیرہ کے اور ہی معنی بیان کرنا۔ یہ چیز بجائے خود بُری نہیں بلکہ عام طور پر تفصیل یا تعبیر کے معنی میں استعمال ہوتی ہے۔ لیکن جب مناسبت کا لحاظ رکھے بغیر اپنے دماغ سے نئے معنی پیدا کر لیے جائیں تو تحریف کی حد میں داخل ہو جاتی ہے۔ یعنی لفظ یا فقرے کی اصل حیثیت ہی بگڑ جاتی ہے۔ یہاں تاویل کا لفظ بھی انھیں معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔

اس نظم میں اقبالؔ نے پنجابی مسلمانوں کے خاصے بڑے حصّے کی بعض عجیب و غریب خصوصیتیں بیان کی ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ یہ خصوصیتیں تمام پنجابیوں میں پائی جاتی ہیں۔

۱۔ مذہب کے معاملے میں پنجابی مسلمان کی طبیعت تازگی اور جدّت بہت پسند کرتی ہے۔ یعنی کوئی شخص نئی چیز مذہب کے نام پر پیش کر دے تو پنجابی اس کی طرف دوڑتا ہے، لیکن کہیں تھوڑی دیر کے لیے یہ ٹھہر جائے تو وہاں سے بہت جلد گزر جاتا ہے، یعنی نئے عقیدے پر زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا۔

۲۔ تحقیق اور چھان بین کا موقع آ جائے تو اس میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا، لیکن کوئی شخص پیری مریدی کا کھیل شروع کر دے تو پنجابی مسلمان بہت جلد ہار جاتا ہے۔ یعنی پیروں کا بہت معتقد ہے۔

۳۔ اگر کوئی شکاری تاویل کا جال بچھا کر بیٹھ جائے تو پنجابی مسلمان اس تیزی سے گرتا ہے ٹھیک اسی طرح جس طرح پرندہ دانہ دیکھتے ہی گھونسلے سے زمین پر اتر کر جال میں پھنس جاتا ہے۔

آزادی

۱۔ انگریزی عہد میں مسلمان کی آزادیٔ فکر اس پیمانے پر پہنچ چکی ہے کہ کسی بات پر اسے ٹوکنے کا حوصلہ نہیں ہو سکتا۔ وہ فکری آزادی کو اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی ایک نعمت سمجھتا ہے۔

۲۔ حالت یہ ہے کہ وہ چاہے تو کعبے کو پارسیوں کا آتش کدہ بنا دے اور چاہے تو اسے یورپ کے بنے ہوئے بتوں سے بھر دے۔

شعر کا مطلب صرف یہ نہیں کہ کعبے سے مسلمان جو سلوک چاہے کر سکتا ہے۔ یہ بھی مراد ہے کہ اسلام کو چاہے تو تاویل سے پارسیوں کی آسمانی کتاب کے مطابق کر دے۔ چاہے تو اسے یورپی تہذیب اور علوم و فنون کا مرقع بنا دے۔ چونکہ ٹوکنے اور روکنے والا کوئی نہیں، اس لیے ہر مسلمان جو چاہے کر سکتا ہے۔

۳۔ آزادیٔ فکر نے اسے یہ بھی حق دے دیا ہے کہ قرآن کو تاویل کا کھلونا بنا دے اور اس سے ایک نئی شریعت پیدا کر لے۔

۴۔ غرض ہندوستان کی سرزمین میں ایک عجیب تماشا درپیش ہے۔ یہاں مسلمان آزاد ہے اور اسلام قید۔

اشاعتِ اسلام فرنگستان میں

اخوّت: بھائی چارا، برادری۔

۱۔ یورپی تمدن کا نظام دین کی روح سے خالی ہے۔ اہلِ یورپ نے نسب کو بھائی چارے اور برادری کی بنیاد بنا رکھا ہے۔

ظاہر ہے کہ جس قوم کے نزدیک بھائی چارے کا معیار نسب، نسل اور خاندان ہو، وہ تو اپنے ہم نسبوں

کے سوا کسی کو بھی خاطر میں نہ لائے گی اور کسی کو برابری کا درجہ نہ دے گی۔ دین کا عمل اس کے سراسر برعکس ہے۔ وہ ہر اس شخص کو برادری کے رشتے میں شامل کر لیتا ہے، جو اسے قبول کرے۔ خواہ وہ کسی قوم، کسی نسل اور کسی رنگ کا ہو۔

۲۔ اگر کوئی برہمن یعنی ہندو حضرت مسیحؑ کا دین قبول کر لے اور عیسائی ہو جائے تو انگریز کی نگاہوں میں اس کا درجہ ہرگز اونچا نہ ہوگا۔ اس لیے کہ انگریز نے بھائی چارے کو مذہب سے نہیں، قوم سے وابستہ کر رکھا ہے۔ اور برہمن انگریز کا ہم قوم نہیں بن سکتا، اگرچہ ہم مذہب بن جائے۔

۳۔ اسی طرح اگر اسلام کا کوئی مبلغ انگریزوں کو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے دین یعنی اسلام کا حلقہ بگوش بنا دے تو بدنصیب مسلمان کی حالت نہ پلٹے گی۔ وہ بدستور محکوم ہی رہے گا۔ اس لیے کہ انگریز بے شک مسلمان کا ہم مذہب بن جائے اس کا ہم قوم نہیں بن سکتا۔

لاؔ و اِلاّ

لا: اشارہ ہے لآ اِلٰہ کی طرف جو کلمۂ توحید کا ابتدائی جزو ہے۔ اِلاّ مُراد ہے اِلاّ اللہ سے۔ لا نفی کا کلمہ ہے جو تمام معبودوں کو ختم کر دیتا ہے۔ اِلاّ صرف ایک معبودِ برحق کو ثابت کرتا ہے۔ اسی لیے اسے نفی و اثبات کہتے ہیں جو ہر وجود میں ثابت ہے۔

۱۔ اگر دانہ خاک کے اندھیرے سے اُٹھ کر نورانی فضا میں نہ آتا تو کبھی اس میں سے شاخیں، پتّے اور پھول پھل پیدا نہ ہو سکتے۔

مُراد یہ ہے کہ دانہ پہلے اپنے آپ کو زمین میں گم کر دیتا ہے۔ یہ اُس کے لیے "لا" کی منزل ہے۔

پھر اُگ کر روشنی میں آتا ہے اور پودا یا درخت بن جاتا ہے۔ یہ اُس کے لیے "اِلاّ" کی منزل ہے۔

۲۔ اس بنا پر ثابت ہوا کہ زندگی کی اصل فطرت میں آغاز لا سے ہوتا ہے اور اِلاّ آخری منزل ہے جس شے کو لا کی منزل میں موت کا پیغام آ گیا۔ وہ اِلاّ سے کبھی آشنا نہ ہوگی۔

۴۔ بالکل یہی حالت اس قوم کی ہے، جس کی نمود کی منزل سے آگے نہیں بڑھ سکتی جس کی یہ کیفیت دیکھو یقین کرلو کہ اس کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

امرائے عرب سے

افتراق: پھوٹ۔ تفرقہ۔ جُداجُدا۔ **بولہبی:** بولہب سے منسوب جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا اور دین اسلام کا سخت دشمن تھا۔ **ثغور:** ثغر کی جمع۔ حدیں۔

۱۔ اگر سرزمینِ عرب کے امیر اور حاکم اسے بے ادبی نہ سمجھیں تو ہندوستان کا یہ مسلمان ان کی خدمت میں کچھ عرض معروض کی جسارت کرنا چاہتا ہے جیسے وہ غالباً برابر کا مسلمان نہ سمجھتے ہوں اور کافروں میں شمار کرتے ہوں۔

۲۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ نکتہ پہلے پہل کس قوم کو سکھایا گیا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں میل ملاپ اور اتحاد و اتفاق کا پیغام لے کر آئے اور ابولہب کی خصلت رکھنے والے دشمنانِ اسلام کی کوشش ہمیشہ یہ رہی کہ انسانوں میں تفرقہ ڈال کر انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیا جائے۔

۳۔ یاد رکھو عرب دنیا کا وجود صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے قائم ہے اور حضورؐ ہی کی ذات پاک پر اس دنیا کا انحصار ہے۔ جن جغرانیائی حدوں پر عرب ناز کر رہے ہیں ان کی حیثیت کیا ہے؟ دنیائے عرب ان کی وجہ سے قائم نہیں رہ سکتی۔

اقبالؒ کی تصریح کے مطابق یہ شعر بھی شیش محل بھوپال میں لکھے گئے۔

احکام الٰہی

مقلّد: پیرو۔ **جمادات:** جماد کی جمع۔ غیر جاندار چیزیں جیسے پتھر، کوئلہ، دھاتیں وغیرہ۔

۱۔ تو پوچھتا ہے کہ انسان کو تقدیر کا پابند رہنا چاہیے یا خدا کے حکموں پر چلنا چاہیے؟ اے عقل مند! اس سوال کا جواب مشکل نہیں۔

۲۔ تقدیر ایک آن میں سو بار بدل جاتی ہے۔ اس کی پیروی کرنے والا ابھی خوش و خرم ہوگا۔ ابھی غمگین۔ جب دیکھے گا کہ مراد پوری ہو رہی ہے تو جامے میں پھولا نہ سمائے گا۔ جب حالت برعکس نظر آئے گی تو آہ و فریاد شروع کر دے گا۔

۳۔ صرف نباتات اور جمادات تقدیر کے پابند ہیں اس لیے کہ وہ عزم و ارادہ سے خالی ہیں۔ مومن فقط خدا کے حکموں کا پابند ہوتا ہے۔ وہ حکموں کے مطابق چلے گا نتیجہ خواہ کچھ ہو۔ اگر ناخوشگوار حالات سے بھی سابقہ آپڑے تو خدا کی رضا سمجھ کر انھیں صبر سے قبول کر لے گا۔

موت

غیب و حضور: غیب محبوبِ حقیقی سے دوری۔ حضور اس کا دیدار۔

۱۔ اگر کسی انسان کا دل زندہ ہو اور اس کی خودی پختگی کے درجۂ کمال پر پہنچ جائے تو موت بھی اسے فنا نہیں کر سکتی۔ زندگی کی طرح موت کے بعد بھی اس کا دل بے قرار ہی رہتا ہے، اس لیے کہ کبھی محبوبِ حقیقی سے دُوری کی منزل پیش آجاتی ہے اور کبھی دیدار نصیب ہوتا ہے۔

۲۔ چاند اور ستاروں کی زندگی شعلے کی طرح ایک دو سانس کی ہوتی ہے، لیکن خودی کی شراب کا نشہ ہمیشہ کے لیے طاری رہتا ہے۔

۳۔ اگر تیری خودی پختہ ہو تو موت کا فرشتہ تیرے جسم کو تو بے شک چھو سکتا ہے لیکن تیرے وجود کے مرکز سے دور ہی رہتا ہے۔ پاس نہیں پھٹک سکتا۔

قُم باذن اللہ

قم باذن اللہ: اُٹھ خدا کے حکم سے۔ **غمین:** غمگین۔ **انا الحق:** یہ کلمہ حسین بن منصور حلاج سے منسوب ہے جسے عام طور پر منصور کہا جاتا ہے۔ وقت کے علماء نے منصور کی زبان سے یہ کلمہ سن کر کفر کا فتوےٰ دیا اور اسے سُولی پر چڑھا دیا گیا۔ بعد کے بعض علماء صوفیہ نے اس کی تاویل کی کہ انا الحق سے مراد "میں خدا ہوں" نہیں، یہ ہے کہ میرا وجود ہیچ ہے اور حقیقی وجود صرف خدا کا ہے۔

اقبالؔ انا الحق کو خودی کا اثبات سمجھتے تھے یعنی انا حق ہے۔

۱۔ اگرچہ دنیا کے حالات ویسے نہیں رہے جیسے پہلے تھے۔ ان میں بہت تبدیلی آگئی ہے اور ناسازگاری حد درجہ بڑھ گئی ہے۔ تاہم تو خدا کے حکم سے اُٹھ اور سرگرم عمل ہو جا۔ اگر حالات ویسے نہیں رہے تو کیا ہوا؟ زمین اور آسمان تو وہی ہیں جو پہلے تھے۔ اپنے جوشِ عمل سے حالات کو سازگار بنا لے۔

۲۔ جس خونِ گرم نے انا الحق کے نعرے میں آگ کی حرارت پیدا کر دی تھی، وہی خون تیری رگوں میں موج زن ہے۔ خدا کے حکم سے اُٹھ اور سرگرم عمل ہو جا۔

۳۔ اگر تیرے عقل و شعور میں بے ربطی نظر آتی ہے تو ہرگز غمگین نہ ہو۔ یہ بے ربطی حقیقی نہیں، غیر حقیقی ہے۔ یہ اہلِ یورپ کے جادو کا نتیجہ ہے جو جلد اتر جائے گا۔ تو اللہ کے حکم سے اُٹھ اور سرگرم عمل ہو جا۔

تعلیم و تربیت

مقصود

اس نظم میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصود کیا ہے؟ پہلے شعر میں مشہور یہودی فلاسفر سپینوزا ولندیزی کا نظریہ پیش کیا ہے، دوسرے میں افلاطون کا اور تیسرے میں اپنا۔ اقبال نے تصریح کر دی ہے کہ یہ شعر سر راس مسعود کے دولت کدے ریاض منزل بھوپال میں لکھے گئے تھے۔

سپینوزا: ہالینڈ کا یہودی فلاسفر ۱۶۳۲ء میں پیدا ہوا۔ ۱۶۷۷ء میں وفات پائی۔

۱۔ سپینوزا۔ عقل مند انسان کی نظر ہمیشہ زندگی پر رہتی ہے۔ زندگی کیا ہے؟ یہ کہ انسان کو محبوب حقیقی کی حضوری حاصل ہو۔ وہ اس سے سرور حاصل کرے۔ اس کا باطن روشن ہو۔

۲۔ فلاطون۔ عقل مند انسان کی نگاہ ہمیشہ موت پر رہتی ہے، اس لیے کہ زندگی کی مثال اس چنگاری کی ہے جو اندھیری رات میں ذرا سی دیر کے لیے چمکے، یعنی فلاطون کے نزدیک زندگی بے حقیقت ہے اور راست موت سامنے رکھنی چاہیے۔

۳۔ اقبال۔ زندگی اور موت ہرگز توجہ کے لائق نہیں۔ خودی کا اصل مقصود صرف خودی ہے، یعنی انسان کو نہ زندگی کی طرف دیکھنا چاہیے نہ موت کی طرف، اپنی خودی کو پختہ کرنا چاہیے۔

زمانۂ حاضر کا انسان

۱۔ موجودہ دور کے انسان کی حالت یہ ہے کہ اس کا دل عشقِ حق سے بالکل خالی ہے اور عقل اسے سانپ کی طرح ڈستی چلی جا رہی ہے۔ وہ عقل کو اپنی نظر کا فرماں بردار نہ بنا سکا۔ اگر ایسا کر لیتا تو عقل اس کے لیے مصیبت کا باعث نہ بنی رہتی۔

۲- وہ ستاروں کے راستوں کا کھوج لگاتا پھرتا ہے، لیکن اپنے افکار کی دنیا میں اس نے کبھی سفر نہ کیا۔ یعنی ستاروں کی دیکھ بھال میں ساری عمر گزار دی، مگر اپنی حقیقت معلوم کرنے کی کبھی کوشش نہ کی۔

۳- وہ اپنی حکمت اور دانش کے پیچ و خم میں اس طرح اُلجھ کر رہ گیا کہ آج تک نفع و نقصان کا بھی فیصلہ نہ کر سکا۔ یعنی اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ زندگی بسر کرنے کا اچھا طریقہ کیا ہے اور بُرا کیا؟

۴- وہ سُورج کی کرنوں کو تو قبضے میں لے آیا اور ان سے مختلف کام لینے لگا، لیکن زندگی کی اندھیری رات میں صبح کا اُجالا پیدا نہ کر سکا۔

اقوامِ مشرق

۱- جن قوموں کی آنکھ محکومی اور تقلید کے باعث اندھی ہو گئی، انھیں بے پردہ حقیقتیں بھی نظر نہیں آ سکتیں مشرقی قوموں کی یہی حالت ہے۔ انھیں مغرب کی محکومی اور اندھی تقلید ہی نے زوال کے آخری درجے پر پہنچا دیا۔

۲- اہلِ یورپ کا جو تمدّن خود قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے وہ ایران اور عرب کو کیونکر زندہ کر سکتا ہے؟

آگاہی

سپہر: آسمان

۱- جس نجومی کی نظر آسمان پر رہتی ہے وہ اپنی خودی کے مقام سے واقف نہیں ہو سکتا۔

۲- جس نے یہ جان لیا کہ خودی کا مرتبہ آسمانوں سے بھی اونچا ہے وہی صبح و شام کی سلطنت یعنی اس دنیا سے آگاہ ہو سکتا ہے۔

۳- وہی جان سکتا ہے کہ نظر کے لیے اچھی چیز کون سی ہے اور بُری کون سی؟ نیز دل کے لیے حلال کیا ہے اور حرام کیا؟

مصلحینِ مشرق

سامری فن: سامری کے طور طریقوں والے جادوگر۔ جب حضرت موسیٰؑ شریعت لانے کے لیے کوہِ طور پر چلے گئے اور انھوں نے چالیس دن وہاں گزارے تو سامری نام یا لقب ایک شخص نے بنی اسرائیل کو گمراہ کر کے اپنے پیچھے لگا لیا اور ایک بچھڑا بنا کر کھڑا کر دیا جس میں سے آواز نکلتی تھی۔ بنی اسرائیل اس کی پوجا میں لگ گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام واپس آئے تو قوم کو اس گمراہی سے نکالا اور سامری کے طلسم کو توڑا۔

ساتگین: پیالہ

۱۔ اے مشرق! میں تیرے ان جادوگر شراب پلانے والوں سے بالکل مایوس ہوں۔ اس لیے کہ وہ تیری محفل میں جو پیالے لے آئے، وہ شراب سے یکسر خالی تھے۔ یعنی ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہ تھی جو قوموں میں زندگی کی نئی رُوح پیدا کر سکتی، لہٰذا انھیں مصلح کیوں کر مانا جائے؟

۲۔ ان بادلوں کے دامن میں نئی بجلیاں کہاں سے آئیں، جن کی آستینیں پرانی بجلیوں سے بھی خالی ہیں؟

مراد یہ ہے کہ جو لوگ پرانے علوم و حقائق سے بھی بالکل ناآشنا ہیں، ان سے نئے علوم و معارف کی کیا اُمید رکھی جا سکتی ہے؟

مغربی تہذیب

عفیف: پاک دامن۔ پاکیزہ۔

۱۔ یورپ کی تہذیب دل اور نظر دونوں کے لیے فساد کا باعث ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس کا تمدّن پاک دامن نہ رہ سکا اور اپنی پاکیزگی کھو بیٹھا۔

۴۔ جب رُوح پاکیزہ نہ رہے تو نہ ضمیر پاک رہ سکتا ہے، نہ خیالات میں بلندی آسکتی ہے۔ نہ ذوق لطیف پیدا ہو سکتا ہے۔ جس وجود میں یہ تینوں چیزیں ناپید ہوں، وہ دل اور نظر دونوں کے لیے خرابی کا باعث ہوگا۔ نہ اس کے اخلاق اچھے ہوں گے، نہ اس کی نظر بلند ہوگی، نہ اس کے مذاق میں لطافت کا کوئی جوھر دکھائی دے گا۔

اسرارِ پیدا

اسرارِ پیدا: کھلے ہوئے بھید۔ **پُردم:** ان تھک۔ **اُفتاد:** گرجانا۔

۱۔ جس قوم کے جوانوں کی خودی فولاد کی طرح مضبوط و مستحکم ہو جائے اسے تلوار کی حاجت نہیں رہتی یعنی وہ ساز و سامان کے بغیر ہی اپنے مقاصد پورے کر لیتی ہے۔

۲۔ اے مخاطب! یہ چاند اور تاروں کی دنیا تیرے سامنے بالکل بے حقیقت ہے۔ تو خود غور کر کہ یہ دنیا سراسر مجبور ہے، اس لیے کہ علم اور ارادے اور نظر سے محروم ہے اور تو آزاد دنیا ہے۔ اس لیے کہ خدا نے تجھے علم، نظر اور ارادے کی دولت عطا کر رکھّی ہے۔

۳۔ موجوں کی تڑپ کیا ہے؟ فقط ذوقِ طلب کا کرشمہ ہے۔ باقی جو کچھ سیپی میں چُھپا ہوا ہے یعنی موتی وہ خدا کی دین ہے مطلب یہ کہ انسان کو موجوں سے ذوقِ طلب حاصل کرنا چاہیے۔ یہ حاصل ہو جائے تو یقیناً خدا کی رحمت کسی کو محروم نہ رکھے گی جس طرح اس نے موجوں کو محروم نہ رکھا اور انھیں موتیوں کی دولت دے دی۔

۴۔ شہباز کی طرح اڑنے کی ایسی مشق کر لینی چاہیئے کہ تھک کر گرنے کی نوبت نہ آئے اگر تو ان تھک بن جائے تو پھر تجھے گرنے کا خطرہ ہو ہی نہیں سکتا۔

سُلطان ٹیپو کی وصیّت

سلطان ٹیپو کا اصل نام **فتح علی خاں** تھا۔ اس کے باپ حیدر علی خاں کے کوئی بچہ نہ ہوا۔ اس لیے **دکن** کے ایک مشہور ٹیپو مستان شاہ کے مزار پر جا کر دعا کی۔ خدا نے بچہ دیا تو **فتح علی خان** کے علاوہ حصولِ برکت کی نیت سے اسے ٹیپو سلطان کہنا شروع کیا۔ یہی نام مشہور ہو گیا۔ ۱۷۸۲ء میں والد کی وفات پر سلطنت میسور کا فرماں روا بنا۔ جو آخری دور میں دکن کی سب سے بڑی، سب سے اچھی اور سب سے طاقت ور سلطنت تھی۔

حیدر علی خاں پہلا فرماں روا ہے جس نے ہندوستان میں انگریزی تسلط کے خطرات کا صحیح اندازہ کیا اور اس خطرے کی بیخ کنی کے لیے زندگی وقف کر دی۔ میدانِ جنگ میں اس کا انتقال ہوا۔ ٹیپو سلطان کو والد کی میراث میں سلطنت کے ساتھ انگریز دشمنی بھی ملی۔ اس نے اپنے عہدِ حکومت کا ایک ایک لمحہ انگریزوں کی مخالفت میں بسر کر دیا۔ سلطان نے ہندوستان کے اندر اور باہر کی ہر قوت کو انگریزی خطرے کے انسداد کے لیے ساتھ ملانے میں کوئی دقیقۂ سعی اٹھا نہ رکھا۔ جب کوئی بھی قوت اس جہاد میں شریک ہونے کے لیے تیار نہ ہوئی، بلکہ مرہٹے اور نظام دشمنوں سے مل گئے تو سلطان نے تنہا جان کی بازی لگا دی اور انگریزوں کے خلاف لڑتے ہوئے ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو شہادت پائی۔ انگریز اسے بڑی سلطنت دے کر ساتھ ملا لینا چاہتے تھے، لیکن وہ جانتا تھا کہ پیشکش قبول کر لینے کے بعد اپنی اور ملک کی آزادی باقی نہ رہے گی۔ اس نے آزادی کے لیے بے تکلف جان دے دی۔ وہ کہا کرتا تھا: کہ شیر کی زندگی کا ایک دن گیدڑ کی زندگی کے سو سال سے بہتر ہے۔ اپنے خونِ شہادت سے اس قول پر مُہر تصدیق لگا دی۔

یہ اشعار ٹیپو سُلطان کی کسی خاص وصیّت کا ترجمہ نہیں بلکہ سلطان کی سیرت کے متعلق اقبال کے تاثرات کا مرقع ہیں۔

رہ نورد: راستہ طے کرنے والا، مسافر۔ **محمل:** کجاوہ۔ **محفل گداز:** محفل کو پگھلا دینے والا۔
دوئی پسند: خدا کے سوا کسی دوسری ہستی کو ماننے والا۔ **لاشریک:** جس کا کوئی شریک نہ ہو۔

۱۔ تو عشق کے راستے کا مسافر ہے؛ اگر یہ سچ ہے تو پھر کہیں ٹھہرنا قبول نہ کر۔ اگر لیلا بھی تیرے پہلو میں آ بیٹھے تو کجاوہ قبول نہ کر۔

مراد یہ ہے کہ جن لوگوں کے دل عشقِ حق سے معمور ہوں وہ دنیا کی کسی چیز سے دل نہیں لگا سکتے اور بڑی سے بڑی نعمت اور دولت بھی ان کے حوالے کر دی جائے تو اسے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتے۔ اور اپنے مقصد میں لگے رہتے ہیں۔

۲۔ اے پانی کی ندی! تو پھیل کر تند اور تیز دریا بن جا۔ تجھے کنارہ عطا کیا جائے تو اُسے ٹھکرا دے۔ یعنی عشقِ حق کا خاصہ یہ ہے کہ وہ کسی جگہ رُکے نہیں۔ ہر لحظہ بڑھتا اور پھیلتا چلا جائے۔

۳۔ تو دنیا کے بُت خانے میں گم نہ ہو جا۔ یعنی اس کی دلچسپیوں میں مگن نہ ہو۔ اس میں عیش و عشرت کے جو سامان ہیں، ان کا متوالا نہ بن۔ تیرے نصب العین کا تقاضا یہ ہے کہ ان سامانوں کو ختم کر دے اور ان کی دل کشی سے محفوظ رہ۔ یہ بالکل سچ ہے کہ جو لوگ بلند مقاصد لے کر آتے ہیں انھیں دنیوی عیش کے سامان ایک لمحے کے لیے گوارا نہیں ہو سکتے خواہ وہ دولت ہو یا سلطنت یا کچھ اور۔

۴۔ دنیا کی پیدائش کے وقت حضرت جبریلؑ نے مجھے یہ سبق پڑھایا تھا کہ جو دل عقل کا غلام ہو اسے قبول نہ کر۔
زندگی میں بہت سے ایسے مرحلے آجاتے ہیں، جب عقل نفع نقصان کے ہیر پھیر میں مبتلا ہو کر انسان کو ادائے فرض سے باز رکھتی ہے۔ بلند ہمت انسانوں نے ہمیشہ فرض کی بجا آوری مقدم رکھی ہے اور خطرات کی کبھی پروا نہیں کی۔

۵۔ عشقِ حق کے لیے آزمایش کا وقت آجائے تو سچا عاشق بے تکلف حق کا راستہ اختیار کر لیتا ہے، خواہ اس کا نتیجہ کچھ نکلے۔ باطل ایسے موقعوں پر اپنے لیے طرح طرح کے بہانے ڈھونڈ لیتا ہے اور وہ حق کے سوا کسی غیر کی اطاعت بھی قبول کر لیتا ہے، حالانکہ حق کا کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ اے مخاطب! تو بھی حق کے ساتھ باطل کو شریک نہ کر۔ اگر اپنے عشق کے دعوے میں سچا ہے تو صرف حق ہی کے لیے زندگی وقف رکھ۔

غزل

تدرو: ایک خوش رفتار جنگلی پرندہ جو چکور سے مشابہ ہوتا ہے۔ بعض اہلِ علم کے نزدیک اس کا تلفظ دسے نہیں ذ سے درست ہے۔ **نواگر:** نغمہ گانے والا۔

۱۔ نہ میں ایرانی ہوں، نہ ہندوستانی، نہ عراقی ہوں، نہ حجازی۔ میں نے تمام امتیازات مٹا دیے اور تمام نسبتیں توڑ ڈالیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ خودی نے مجھے دونوں جہانوں سے بے نیاز کر دیا۔ یعنی میری نظر چھوٹے خطوں میں محدود نہ رہی۔ نظر کی کشادگی اور بلندی مجھے خودی کی بدولت نصیب ہوئی۔ حق یہ ہے کہ خودی انسان کو انسانیت کے اونچے درجے پر پہنچاتی ہے۔ پھر وہ چھوٹے چھوٹے امتیازات کا روادار نہیں ہوتا۔ انسانی برادری کی بنیا داستوار کرتا ہے اور اسی کے لیے زندگی وقف کر دیتا ہے۔

۲۔ تیرے نزدیک زندگی کا مقصد یہ ہے کہ اپنے سانس گنے یعنی دیکھے کتنے سال اور کتنی مدت زندہ رہا۔ میرے نزدیک اصل مقصد یہ ہے کہ انسان سانس کو عشقِ حق کی حرارت سے پگھلائے۔ رضائے الٰہی کے کاموں کے لیے وقف رہے۔ خلقِ خدا کی زیادہ سے زیادہ خدمت انجام دے اور اس راہ میں جو مشقتیں اور مصیبتیں پیش آئیں انھیں صبر سے برداشت کرلے۔ دونوں کے مقصد میں فرق کا نتیجہ یہ نکلا کہ میری نظر میں تو دین سے بیگانہ ہو گیا اور تیری نظر میں، میں دین سے بیگانہ رہا۔

۳۔ اسلام شہبازی کا دین تھا۔ یہ انسانوں میں عشقِ حق کے لیے محنت، مشقت، ہمت اور جانبازی کے جوہر پیدا کرنے کے لیے آیا تھا۔ تجھ میں شہبازی کا کوئی وصف باقی نہ رہا۔ تو تدرو بن گیا۔ جب خود بدل گیا تو اچھا ہوا کہ تو نے شریعت بھی بدل لی۔ اسلامی شریعت اب تجھے کیا راس آسکتی ہے۔

۴۔ تیرے بیابانوں میں مجھے وہ دیوانگی، وہ جذبۂ عشق کہیں دکھائی نہ دیا جو عقل کو بگڑے ہوئے کام بنا لینے اور مقصد پورے کرنے کے طریقے سکھائے۔

۵. نغمہ گانے والے کو زندگی کے اضطرابات اور بے قراریوں سے الگ نہ رہنا چاہیے۔ اس قسم کے نغمے قوموں کو ہلاکت کے غار میں گرا دیتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ اگر شاعر زندگی کے حقایق سے بے تعلق ہو جائے تو اس کے شعر قوموں میں زندگی کی رُوح کچل کر رکھ دیتے ہیں۔

بیداری

اشراق: طلوع ہونا۔ رُوشن ہونا۔ **اعماق:** عمق کی جمع۔ گہرائی۔

۱۔ جس مردِ حق کی خودی بیدار ہو جاتی ہے اس میں تلوار جیسی کاٹ اور چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

مراد یہ ہے کہ جو بندۂ مومن اپنی حقیقت پہچان لیتا ہے، اس کا ہر سانس ایسی چمکنے اور کاٹنے والی تلوار بن جاتا ہے جس سے کفر و باطل پاش پاش ہو جاتے ہیں۔

۲۔ ابھرنے اور طلوع ہونے کی جو قوّت ذرّے ذرّے میں چھپی ہوتی ہے۔ وہ مردِ حق کی تیز نگاہی پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ یعنی بندۂ مومن پر کائنات کے تمام بھید کھُل جاتے ہیں۔

۳۔ اے مخاطب! تجھے اُس مردِ حق سے کوئی نسبت نہیں۔ تُو کائنات کا تابع اور غلام ہے، وہ کائنات پر حکمرانی کرتا ہے۔ یعنی عام مسلمان دنیوی حرص و ہوا میں گرفتار ہو کر پستی کے گڑھے میں گرے ہوئے ہیں اور بندۂ مومن اپنی خودی کو پختہ و مکمل کرنے کی وجہ سے ارفع و اعلیٰ مقام پر فائز ہو کر زمان و مکان پر حکومت کر رہا ہے۔ تو بھی احکامِ الٰہی پر عمل کر کے مردِ حق بننے کے لیے سرگرم جد و جہد میں مصروف ہو جا۔

۴۔ اے مسلمان! تیرے دل میں ابھی کنارے کی آرزو بھی پیدا نہیں ہوئی اور مردِ حق فطرت و طبیعت کی پاکیزگی کے باعث کائنات کی گہرائیوں سے آگاہ ہو گیا ہے۔ یعنی بندۂ مومن تو زندگی کے بھیدوں اور حقیقتوں سے واقف ہو کر کامیابی سے ہم کنار ہو گیا اور تجھ میں ابھی کامیابی کی اُمنگ ہی پیدا نہیں ہوئی۔

خودی کی تربیت

شعیب: مدین کے پیغمبر حضرت شعیب علیہ السّلام جن کا مرکزی مقام مصر و عرب کے راستے پر واقع تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام مصر سے نکلے تھے تو حضرت شعیبؑ ہی کے پاس ٹھہرے تھے۔ انھیں کی صاحبزادی سے حضرت موسیٰؑ کی شادی ہوئی تھی۔ پیغمبری سے پیشتر حضرت موسیٰؑ کی پوری تعلیم و تربیت حضرت شعیبؑ ہی نے فرمائی تھی۔ جب وہ اپنے اہل و عیال لے کر مصر کی طرف روانہ ہوئے تو خدا نے اپنی رحمت سے انھیں پیغمبر بنا کر فرعون کی اصلاح اور بنی اسرائیل کی آزادی کے لیے مقرر فرمادیا۔

شبانی: بھیڑ بکریاں چرانا

۱۔ انسان خاک کا پتلا ہے۔ اس پتلے میں سب کچھ جلا ڈالنے والی آگ اُسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ خودی کی تربیت کی جائے۔

سب کچھ جلا ڈالنے والی آگ سے مراد یہ ہے کہ ایسی آگ جو باطل کو گھاس پھوس کی طرح بھسم کر کے رکھ دے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں خدا کی رضا کے مطابق انسانیت کی خدمت کرنے کی صلاحیت اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ وہ خودی کو پختہ کر لے۔

۲۔ کلیمی کا بھید ہر زمانے میں ایک ہی رہا ہے اور وہ یہ کہ بیابان کی ہوا ہو، حضرت شعیبؑ جیسا خدا کا چنا ہوا بزرگ تعلیم و تربیت فرمائے اور انسان دن رات گلہ بانی کرے۔

سرّ کلیمی کا مطلب ہے ایمان و عمل کی وہ شان پیدا کر لینا جو حضرت موسیٰؑ میں تھی اور جو فرعون جیسے جابر بادشاہ کے خلاف لگاتار جہاد کی شکل میں نمایاں ہوئی۔ اقبال فرماتے ہیں کہ جابر بادشاہوں سے قوموں کے لیے آزادی حاصل کرنا سہل نہیں۔ حضرت موسیٰؑ کو دیکھیے وہ مصر میں آرام و آسایش کی اس زندگی سے کنارہ کش ہو گئے جو شاہی گھرانے میں انھیں ہر وقت میسّر تھی۔ اس کے برعکس مدین میں

رہنا قبول کر لیا، جس کی حیثیت مصر کی اعلیٰ شہری زندگی کے مقابلے میں بیابان کی سی تھی۔ وہاں انھیں حضرت شعیبؑ جیسے بزرگ رہنمائی کے لیے مل گئے۔ انھوں نے بھی سالہا سال حضرت موسیٰؑ کی بھیڑ بکریاں چرائیں۔ گویا آرام و راحت کی زندگی چھوڑ کر انسان جب تک حد درجہ جفاکش نہ بن جائے اور اس طرح صبر و استقلال کی قوت کو اعلیٰ درجے پر نہ پہنچا لے۔ اس وقت تک لیڈری اور سرداری کے فرائض انجام دے سکتا ہے۔ نہ انسانوں کی حقیقی خدمت سے عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ نری جفاکشی کافی نہیں، ایسی تربیت بھی ضروری ہے جس کی بنیاد آسمانی فیض پر ہو۔ حضرت موسیٰؑ کی مثال بہت واضح اور روشن ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ زمانہ کتنا ہی بدل جائے یہ بنیادی چیزیں اپنی جگہ قائم ہیں۔

آزادیٔ فکر

تدبّر: دور اندیشی

۱۔ جن لوگوں کو سوچ بچار اور دور اندیشی کا سلیقہ نہ ہو، ان کے لیے افکار کی آزادی تباہی کا باعث بن جاتی ہے۔
۲۔ اگر سوچ بچار کی قوت خام اور ناپختہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ افکار کی آزادی انسانوں کو حیوان بنا کر رکھ دے گی

مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو افکار کی آزادی دینا اُسی صورت میں مناسب ہے کہ اس آزادی سے صحیح کام لینے کی ان میں صلاحیت ہو۔ بچّے کے سامنے انگارا رکھ دیا جائے تو وہ اسے چمکتا دیکھ کر ہاتھ میں لینے کی کوشش کرے گا۔ اگر اس کے ہاتھ میں تیز چاقو دے دیا جائے تو وہ اپنے آپ کو زخمی کر لے گا اس لیے کہ اسے نیک و بد کی تمیز نہیں۔ وہ نہیں جانتا کہ انگارا جلاتا ہے اور چاقو زخمی کر دیتا ہے۔ یہی حالت آزادیٔ افکار کی ہے۔ یہ بے سمجھ لوگوں کو ملے گی تو یقیناً اپنے آپ کو برباد کر لیں گے۔ یا انسانوں کے بجائے حیوان بن جائیں گے۔ یعنی انھیں بُرے بھلے کی تمیز نہ رہے گی اور آزادی کے بےجا استعمال کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔

خودی کی زندگی

پرنیاں : ایک قسم کا پھولدار ریشمی کپڑا **حریر :** ریشم۔ **نہنگ :** مگرمچھ۔ **محیط :** سمندر **سراب :** تیز گرمی میں سورج کی کرنیں بیابان کی ریت پر پڑتی ہیں تو اس سے لہریں سی اٹھنے لگتی ہیں تو دور سے دیکھنے والے کو بہتا ہوا پانی معلوم ہوتا ہے، حالانکہ حقیقت میں ریت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، لہٰذا سراب سے نظر کا دھوکہ مراد لیتے ہیں۔

۱۔ خودی زندہ ہو تو درویشی بھی شہنشاہی کے برابر ہوتی ہے۔ یقین جانئے کہ درویش کا دبدبہ اور شان و شوکت طغرل اور سنجر جیسے جلیل القدر بادشاہوں سے کم نہیں ہوتا۔

۲۔ خودی زندہ ہو تو اس سمندر سے بھی پا پیادہ گزر سکتے ہیں جس کے کناروں کا پتہ نہ لگ سکے۔ اس سلسلے میں حضرت موسیٰؑ کی مثال سب کو معلوم ہے کہ وہ بنی اسرائیل کو لے کر آئے اور سمندر سے پا پیادہ بخیر و عافیت گزر گئے۔ فرعون نے لاؤ لشکر کے ساتھ ان کا پیچھا کیا تو ڈوب گیا۔

خودی زندہ ہو تو پہاڑ بھی اپنی سنگینی کے باوجود ریشم کی طرح نرم اور ملائم معلوم ہوں گے۔ یعنی پہاڑ اور سمندر اس دنیا کی بڑی رکاوٹیں سمجھی جاتی ہیں، لیکن جس کی خودی زندہ ہو، اس کے سامنے یہ رکاوٹیں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں سمندروں کو وہ پا پیادہ عبور کرے گا اور پہاڑوں سے اس طرح گزر جائے گا، جیسے قدرت نے اس کے لیے نہایت نرم اور ملائم ریشم کے فرش بچھا رکھے ہیں۔

۴۔ دیکھو، مگرمچھ زندہ ہوتا ہے تو سمندروں میں بھی آزادی سے بھاگتا دوڑتا پھرتا ہے۔ کوئی شے اُسے روک نہیں سکتی، لیکن مرے ہوئے مگرمچھ کے لیے سراب کی لہر بھی زنجیر بن جاتی ہے۔ حالانکہ وہ لہر محض نظر کا دھوکا ہوتی ہے۔ اس کی حقیقت کچھ نہیں۔ یعنی جو زندگی کی قوت کا مالک ہو اس کے لیے حقیقی لہریں بھی کچھ حیثیت نہیں رکھتیں۔ جس کی زندگی ختم ہو چکی ہو، وہ فرضی اور نمائشی لہروں سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

حکومت

اقبال نے خود فرمایا ہے کہ یہ شعر سر راس مسعود مرحوم کے مکان ریاض منزل بھوپال میں لکھے گئے۔

دیر کہن: لفظی معنی پرانا بت خانہ، مراد دنیا۔ **انگبیں:** شہد۔ **تلخاب:** کڑوا پانی۔ زہر۔

۱۔ مرید تو سچی بات کسی نہ کسی طور سن ہی لیتے ہیں، لیکن شیخ اور ملا کو درویش کی بات بری لگتی ہے۔ یعنی جو کچھ میں کہتا ہوں، وہ عام لوگوں کو تو برا نہیں لگتا، مگر صوفیوں اور عالموں کو میری باتیں چبھتی ہیں۔

۲۔ حق یہ ہے کہ جب ذات وصفات کے متعلق موشگافیاں شروع ہو جاتی ہیں تو پھر قوم عمل کا سرمایہ کھو بیٹھتی ہے۔ قوتِ عمل اسی وقت تک باقی رہتی ہے، جب قوم کے سامنے صرف وہ مسائل پیش ہوتے رہیں جن کا تعلق ان کے مقاصد سے ہو اور جو ان میں عمل کی سرگرمی کو تیز رکھیں۔ جب ایسی بحثیں شروع ہو جائیں، جن سے بے سود الجھنوں کے سوا کچھ نہ نکل سکے تو قوم میں افسردگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس میں بلند کارناموں کے لیے جوش و خروش باقی نہیں رہتا۔

ذات وصفات سے مراد ہے باری تعالیٰ کی ذات وصفات یعنی ذات کی حقیقت کیا ہے؟ صفات کا ذات سے کیا تعلق ہے؟ صفات کو غیر ذات سمجھا جائے یا عین ذات؟ اس قسم کے متعدد مسائل ہیں جو فلسفیوں نے پیش کر رکھے ہیں۔ اسلامی تعلیم یہ ہے کہ اس قسم کے مسئلوں پر غور کرنے کے بجائے مسلمان کو خدا کی ان نشانیوں پر غور کرنا چاہیے، جو کائنات میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ ان سے ایمان اور قوتِ عمل میں پختگی آتی ہے۔

۳۔ اگرچہ اس دنیا کا یہ دستور قدیم زمانے سے چلا آتا ہے کہ یہاں شراب خانہ ہو یا شراب پلانے والا یا شراب کی صراحی، غرض کوئی بھی چیز قائم رہنے والی نہیں۔ یعنی اس دنیا کی ہر چیز آنی و فانی ہے۔

۴۔ تاہم اقبال مندی کے مے خانے سے شراب لینے کا حق اسی قوم کو ہے، جس کے جوان زندگی کے زہر کو شہد سمجھیں یعنی جتنی تلخیاں، پریشانیاں، مصیبتیں اور آفتیں انھیں پیش آئیں، وہ سب خوشی خوشی جھیل لی جائیں، لیکن مقاصد سے منہ نہ موڑا جائے۔

ہندی مکتب

مقالات: اقوال باتیں۔ **گراں سیر:** سست رفتار۔ **ابدیّت:** ہمیشگی۔ **مرگِ مفاجات:** ناگہانی موت۔ **خرافات:** خرافہ نام ایک عرب تھا جو بہت جھوٹ بولتا تھا۔ لوگ اس کی باتوں کو لغو سمجھتے تھے، لہٰذا خرافات کا مطلب ہوا لغو باتیں۔

اس نظم میں آزاد اور محکوم کی حالت کا نقشہ نہایت پُر تاثیر انداز میں کھینچا گیا ہے۔

۱۔ اے اقبال! آج کل کی درس گاہوں میں علمِ خودی کا نام نہ لے۔ ایسی باتیں یہاں کی درس گاہوں کے لیے موزوں نہیں۔

۲۔ یہاں جن نوجوانوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ ان کی حیثیت ممولوں سے زیادہ نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ شہباز کے احوال اور مقامات ممولوں کی نظر سے چھپے رہیں۔

اقبال کا مطلب یہ نہیں کہ نوجوان ممولے پیدا ہوئے۔ وہ کہنا چاہتے ہیں کہ انھیں غلط تعلیم و تربیت کی بنا پر ممولے بنا دیا گیا اور ان میں مردانگی و جاں بازی کا کوئی جوہر باقی نہ چھوڑا گیا۔ ایسے نوجوانوں کو شہبازی کی تعلیم کیونکر دی جا سکتی ہے؟

۳۔ آزاد کی زندگی کا ایک لمحہ محکوم کی زندگی کے ایک سال کے برابر ہوتا ہے۔ افسوس محکوم کے وقت کی رفتار کتنی سست ہے؟

واضح رہے کہ آزاد اور محکوم کے وقت کا پیمانہ نہیں بدلتا۔ صرف آزاد کے کارناموں کی بدولت اس کا وقت بیش بہا بن جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ ایک لمحے میں جو کچھ کر لیتا ہے، محکوم ایک سال میں بھی نہیں کر سکتا۔

۴۔ آزاد کا ہر لمحہ اس کے لیے ہمیشگی کا پیغام ہو جاتا ہے یعنی وہ ایسے کارنامے انجام دیتا رہتا ہے جو اس کا نام ہمیشہ زندہ رکھیں لیکن محکوم کا ہر لمحہ اس کے لیے نئی ناگہانی موت کا باعث ہوتا ہے وہ ذلت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ ہر آن حاکموں کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگا رہتا ہے اور اپنے طبعی جوہر کھو بیٹھتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے ایک ایک لمحہ ہی دکھ اور رنج لاتا

ہے جو ناگہانی موت سے پیدا ہوتا ہے۔

۵۔ آزاد کی فکر اور عقل حقیقت کے نور سے روشن رہتی ہیں۔ محکوم کی عقل لغو باتوں میں اُلجھ کر رہ جاتی ہے

مراد یہ ہے کہ آزاد ہمیشہ حقیقتوں پر نظر رکھے گا۔ فضول وہموں اور لغو باتوں میں کبھی وقت ضائع نہ کرے گا۔ محکوم کی پوری زندگی ہی فضولیات میں گزرتی ہے۔

۶۔ محکوم پیروں کے پیچھے پھرتا رہتا ہے۔ ان کی کرامتوں کی دُھن میں لگا رہتا ہے۔ آزاد خود اس دنیا میں خدا کی ایک زندہ کرامت ہے۔

۷۔ محکوم کے حق میں وہی تعلیم اور تربیت اچھی ہے جو آج کل ہمارے نوجوانوں کو دی جاتی ہے یعنی گانا بجانا تصویریں بنانا اور نباتات کا علم پڑھنا۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بھی چیز نوجوانوں میں زندگی کی حقیقی روح نہیں پھونک سکتی۔

تربیت

اس نظم میں یہ بتایا گیا ہے کہ تعلیم الگ شے ہے اور تربیت الگ۔

ایاغ: پیالہ۔ **کبریت:** لفظی معنی گندھک۔ آج کل عربی اور فارسی میں دیا سلائی کو بھی کہتے ہیں جس کے سر سے پر گندھک لگا دی جاتی ہے تاکہ رگڑ کر اسے جلایا جا سکے۔

۱۔ زندگی کے طور طریقے اور چیز ہیں، علم کچھ اور ہے۔ زندگی صحیح طریق پر بسر کرنے کے لیے جگر میں سوز اور تپش پیدا ہونی چاہیے۔ علم کا سوز صرف دماغ تک محدود رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ دماغ کا سوز زندگی کی منزلوں میں کام نہیں دے سکتا اور وہاں دل و جگر کے سوز کے بغیر گزارہ نہیں ہو سکتا۔

۲۔ علم سے دولت بھی ملتی ہے اقتدار بھی حاصل ہو سکتا ہے اور اس میں مگن رہنے والے کو دلچسپی اور لذت بھی حاصل ہوتی ہے، لیکن ایک مصیبت ہے اور وہ یہ کہ تنہا علم سے اپنی حقیقت کا کھوج نہیں لگا یا

جا سکتا۔

۳۔ علم والے لوگ ہر جگہ مل جاتے ہیں لیکن اہلِ نظر بہت کم ہیں۔ پھر اس پر حیرانی کیوں ہو کہ تیرا پیالہ فیض کی شراب سے خالی رہ گیا؟ یعنی کوئی اہل نظر تجھے نہ مل سکا جو صحیح تربیت دے کر زندگی کے آداب سکھا دیتا

۴۔ آج کل کی درس گاہوں کے استادوں نے جو طریقے اختیار کر رکھے ہیں، ان سے دل کیوں کر روشن ہو سکتے ہیں؟ کیا دیا سلائی سے بھی بجلی کے چراغ کبھی جلے ہیں؟

مراد یہ ہے کہ دیا سلائی سے چراغ جلانے کا طریقہ پرانا ہے۔ وہ طریقہ بجلی کے چراغوں پر استعمال نہیں ہو سکتا جو آج کل رائج ہیں۔ انھیں روشن کرنے کے لیے تو بجلی کی رو درکار ہے۔ اسی کا بندوبست ہونا چاہیے۔

خوب و زشت

فراز و نشیب: بلندی اور پستی۔ **قبیح**: برا۔

۱۔ جس طرح آسمان کی نیلی فضاؤں میں ستارے نکلتے اور ڈوبتے ہیں، اسی طرح انسانی خیالات کے لیے بھی طلوع و غروب کا نظام موجود ہے۔ یعنی خیالات پیدا ہوتے ہیں، کچھ مدت تک دنیا میں مقبول رہتے ہیں۔ پھر اس طرح بھلا دیے جاتے ہیں جیسے ان کا وجود ہی نہ تھا۔

۲۔ خودی کی دنیا میں بھی بلندی اور پستی موجود ہے، جیسی کہ ہماری اس مادی دنیا میں نظر آتی ہے۔ خودی کی دنیا میں بھی اچھی اور پسندیدہ چیزوں سے بری اور ناپسندیدہ چیزیں جنگ کرتی رہتی ہیں۔

۳۔ جو شے خودی کی بلندی سے ظاہر ہو، وہ حسین و جمیل ہوتی ہے، لیکن جو خودی کی پستی میں پیدا ہو گی، وہ ہمیشہ بری اور ناپسندیدہ سمجھی جائے گی۔

خودی کی بلندی سے نمایاں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خودی کی منزلیں طے کر کے انتہائی بلندی پر پہنچ گئی اور اور اس پر حسن و خوبی کی مہر لگ گئی۔ جو خودی کی پستی سے پیدا ہو گی، وہ یقیناً خودی سے محروم سمجھی جائے گی، لہٰذا اس کی

گرانی میں شبہ نہ ہونا چاہیے۔

مرگِ خودی

جذام: کوڑھ۔ **عروق:** عرق کی جمع رگیں۔ **عظام:** عظم کی جمع ہڈیاں۔ **شکستہ بال:** جس کے بال و پر ٹوٹے ہوئے ہوں۔ **احرام:** وہ خاص لباس جو حج اور عمرہ کی غرض سے خاص وقت کے لیے حرم کے اردگرد کے خاص مقامات سے پہنا جاتا ہے۔

۱۔خودی کے مرجانے سے یورپ کا باطن بے نور ہو گیا اور اس میں روشنی کی کوئی کرن باقی نہ رہی۔خودی کے مرجانے سے سرزمین مشرق کوڑھ کی بیماری میں مبتلا ہو گئی۔

۲۔خودی کے مرجانے سے عربوں کی روح تڑپ اور حرارت سے محروم ہو گئی۔خودی کے مرجانے سے عراق اور ایران کے جسم رگوں اور ہڈیوں سے خالی ہو گئے۔ظاہر ہے کہ جس جسم میں نہ رگیں ہوں، نہ ہڈیاں، اس میں زندگی کی روح باقی نہیں رہتی۔

۳۔خودی کے مرجانے سے ٹوٹے ہوئے پر و بال والے ہندوستانیوں نے پنجرے کو اپنے لیے حلال سمجھ لیا اور گھونسلے کو حرام یعنی وہ محکومی پر راضی ہو گئے اور اپنا پیدائشی حق حاصل کرنے کا ان میں کوئی جذبہ نہ رہا۔

۴۔خودی کے مرجانے سے حرم کا شیخ یعنی مذہبی پیشوا اس بات پر مجبور ہو گیا کہ مسلمانوں کا احرام کا لباس لے کر بیچ کھائے۔

مطلب یہ کہ پیشوا اسے دین تو صرف دین کی حفاظت کے لیے ہوتا ہے۔جو پیشوا حاجیوں کے احرام بیچ بیچ کر کھائے یا حج کے ٹیکسوں سے دولت جمع کرے، جیسا کہ ضربِ کلیم لکھنے کے وقت ہوتا تھا، اسے پیشوا کون مانے گا؟

مہمانِ عزیز

۱۔ جو نوجوان درس گاہوں میں پڑھ رہے ہیں ان کے دل و دماغ علم کے افکار سے بھرے ہوئے ہیں۔ اس زمانے میں اچھے بُرے اور نیک و بد کی تمیز کون کرتا ہے؟

۲۔ میری نصیحت تو یہ ہے کہ دل کا کوئی نہ کوئی حصہ خالی رکھ لینا چاہیے۔ شاید کہیں سے کوئی عزیز مہمان آجائے۔ اگر دل میں جگہ خالی نہ ہو گی تو اسے کہاں ٹھہرایا جائے گا؟

مہمانِ عزیز سے مُراد ہے کوئی ایسی فکر یا ایسا جذبہ جو دل و دماغ میں نیکی اور صلاحیت کی روشنی پیدا کر دے فرماتے ہیں کہ جو علم پڑھ رہے ہو، اس میں مضایقہ نہیں، لیکن جس شے کی بدولت حقیقی انسانی رُوح بیدار ہوتی ہے، اس کے لیے بھی تو کچھ انتظام کر لینا چاہیے۔ اسی صورت میں یہ علم بھی کار آمد ہو سکے گا۔

عصرِ حاضر

لادینی: بے مذہب۔

۱۔ پختہ خیالات اور پکی باتیں کوئی کہاں جا کر ڈھونڈے؟ زمانے میں ایسی ہوا چل گئی ہے۔ جس سے کوئی بھی چیز پختہ نہیں ہوتی خام رہتی ہے۔

۲۔ آج کل کی درس گاہوں میں عقل کو بے شک آزادی مل جاتی ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہ درس گاہیں نوجوانوں کے خیالات میں کوئی ربط و نظام پیدا نہیں کرتیں اور انھیں بے ربطی و پریشانی کی حالت میں چھوڑ دیتی ہیں۔

مطلب یہ کہ نوجوانوں کی عقل پُرانے زمانے کی طرح ہر الٹی سیدھی بات کو تو قبول نہیں کرتی جو کچھ بھی اس کے سامنے پیش کیا جائے اس کے لیے دلیل مانگتی ہے لیکن جو نوجوان درس گاہوں سے تعلیم پا کر نکلتے ہیں ان کے

خیالات عموماً بے ربط ہوتے ہیں۔ وہ کسی ایک مسئلے پر نہ ٹھنڈے دل سے غور کر سکتے ہیں۔ نہ خود ٹھیک سمجھتے ہیں، نہ دوسرے کو سمجھا سکتے ہیں۔ نہ زندگی میں ان کا کوئی خاص نصب العین ہوتا ہے جس کے لیے دل جمعی سے کوشش کرتے رہیں۔ اس حالت میں عقل کی آزادی سے کیا خوشی حاصل ہو سکتی ہے؟ وہ تو صرف شکوک پیدا کرنے میں لگی رہے گی جس سے عملی قوت برباد ہوتی جائے گی۔

۳۔ اہلِ یورپ کی مصیبت یہ ہے کہ ان کے افکار و خیالات مذہب کی روح سے خالی ہو گئے۔ اس لیے ان میں عشقِ حق کا کوئی جذبہ باقی نہیں رہا، بلکہ کہنا چاہیے کہ عشق مر گیا۔ مشرق کی یہ حالت ہے کہ یہاں عقل موجود ہے، تاہم اہلِ مشرق کے خیالات میں کوئی ربط و نظام نظر نہیں آتا۔ اس وجہ سے عقل غلام بن کر رہ گئی ہے۔

خودی یا حقیقی زندگی کے لیے عقل اور عشق دونوں ضروری ہیں۔ یورپ میں عشق مر گیا۔ ایشیا میں عقل پر غلامی کی موت طاری ہو گئی۔ گویا دونوں جگہ صحیح زندگی بسر کرنے کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔

طالب علم

۱۔ اے نوجوان! جو طلبِ علم میں لگا ہوا ہے، تیرے لیے میری دُعا ہے کہ خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے تُو اگرچہ سمندر ہے، لیکن تیری لہروں میں مجھے کوئی بیتابی اور بے قراری نظر نہیں آتی۔ ایسا سمندر ہونے سے کیا حاصل جس میں موجیں ایک دوسری سے ٹکرا نہ رہی ہوں؟ یہ حالت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے کہ سمندر میں طوفان آجائے۔

اقبالؔ اس شعر میں نوجوان سے یہ کہ رہے ہیں کہ تیرے دل میں نہ کسی بلند مقصد کی آرزو ہے، نہ عشقِ حق کا کوئی جذبہ نظر آتا ہے۔ دُعا یہی ہے کہ خدا یہ چیزیں تجھے عطا کر دے۔

۲۔ تو کتابیں پڑھنے اور رٹنے میں لگا رہتا ہے اور اس سے تجھے فراغت نہیں ملتی تُو "کتاب خواں" بن گیا، مگر "صاحبِ کتاب" نہ بنا۔

صاحبِ کتاب سے مراد یہ ہے کہ وہ شخص جس کے سامنے کتابوں کے مطالب اس طرح روشن ہوں جیسے وہ کتابیں خود اس نے لکھیں۔ ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تو غیروں کے علوم کی کتابیں تو پڑھ گیا لیکن الہامی کتابوں سے فیض حاصل نہ کیا۔

امتحان

فتادگی: ایک جگہ پڑا رہنا۔ عاجزی۔ **سرافگندگی:** سر جھکانا۔ **سنگِ خارا:** ایک قسم کا سخت پتھر۔

۱۔ پہاڑ کی ندی نے کنکر سے کہا کہ تو ایک جگہ پڑے رہنے یعنی عاجزی اور سرنگونی ہی کو زندگی کا کمال سمجھے بیٹھا ہے۔

۲۔ تیری حالت یہ ہے کہ تجھے ہر کوئی پاؤں سے روندڈالتا ہے اور تو دکھ درد میں مبتلا رہتا ہے۔ ذرا میری شان تو دیکھ کہ دریا بھی میرے آگے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ یعنی میں پہاڑوں سے ٹکراتی اور خود اپنا راستہ بناتی آگے بڑھی چلی جاتی ہوں۔ دریاؤں اور سمندروں کا وجود میرے ہی دم قدم سے قائم ہے۔

۳۔ تو نے دنیا میں کسی دیوار سے ٹکر نہ لی۔ کون جانتا ہے کہ تو سنگِ خارا ہے یا نرا کانچ؟

مطلب یہ کہ تو نے زندگی میں کبھی بہادروں کی طرح آفتوں اور مصیبتوں کا مقابلہ کر کے اپنے جوہر نہ دکھائے دنیا تو اسی کو باکمال سمجھتی ہے جو بے پناہ قوت وطاقت کے بل پر پیش آنے والی شدید مشکلات سے ٹکرا کر ان پر غالب آجائے اور لوگوں سے اپنی سربلندی وعظمت کا لوہا منوالے۔ جب تو ہر وقت سر جھکائے چپکے سے زمین پر پڑا رہتا ہے تو دنیا کیوں کر تیری بڑائی کی قائل ہو؟ لہٰذا اسے کیا خبر کہ تو سخت پتھر ہے یا شیشے کا ایک نرم ونازک ٹکڑا؟

مدرسہ

خفّاش: چمگادڑ۔

۱۔ اے کالج کے مسلمان نوجوان! موجودہ زمانہ تیرے لیے موت کا فرشتہ ہے جس نے تجھے روزی کی فکر دے کر تیری رُوح قبض کر لی، یعنی انگریز نے ایسا نظام حکومت قائم کر رکھا ہے کہ تو رات دن روٹی کمانے ہی کی فکر میں گھُلتا رہے اور تیرے دل میں آزادی وغیرہ کا کوئی بلند جذبہ پیدا ہی نہ ہو سکے۔

۲۔ مقابلے کی کھینچا تانی سے تیرا دل کانپ اُٹھتا ہے۔ جب زندگی تکلیف برداشت کرنے کی لذّت کھو بیٹھتی ہے تو وہ موت بن جاتی ہے۔

مُراد یہ ہے کہ تو دفتر میں اپنے حاکموں سے خوف کھاتا ہے اور اسی وجہ سے اسلامی احکام پر عمل کرنے سے جھجکتا ہے۔ تجھ میں مصیبت جھیلنے کا احساس باقی نہیں رہتا۔ اس لیے تیری زندگی موت کی صورت میں بدل جاتی ہے۔

۳۔ تعلیم نے تجھے اس جنون سے محروم کر دیا ہے جو عقل سے کہتا تھا کہ بہانے نہ بنا۔ یعنی درس گاہوں میں نصابِ تعلیم ایسا ہے جو اسلام سے بے گانہ رکھتا ہے۔ اس لیے مسلمان نوجوانوں میں حق پر قربان ہو جانے اور جہاد کرنے کے بلند و پاکیزہ جذبات پیدا نہیں ہوتے۔

۴۔ قدرت نے تجھے شاہین کی آنکھ عطا کی تھی، لیکن غلامی نے اس میں چمگادڑ کی نظر رکھ دی۔

مطلب یہ کہ انگریز نے تجھے غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر حق بیں نظروں سے محروم کر دیا۔ تو اندھا ہو گیا اور سُورج کی روشنی کو دیکھ نہیں سکتا۔ تجھے چاہیے کہ اس دشمنِ اسلام حاکم کے ہتھکنڈوں میں نہ آئے اور اپنی کھوئی ہوئی حقیقت بیں نظریں پھر حاصل کر لے۔

۵۔ درس گاہ نے جو بھید تیری نگاہوں سے چھپا رکھے ہیں۔ وہ پہاڑ اور جنگل کی تنہائی میں صاف نظر آتے ہیں۔ یعنی کالج کی تعلیم نے جن حقیقتوں سے تجھے بیگانہ بنا رکھا ہے وہ پہاڑوں اور جنگلوں میں رہنے والے مردانِ حق کے

فیضِ صحبت سے حاصل ہو سکتی ہیں۔ اس لیے اے مسلمان جوان! تو صاحب دل بزرگوں سے فیض حاصل کر تاکہ تجھ میں کفر کا مقابلہ کرنے کی قوت پیدا ہو سکے۔

حکیم نطشہ

نطشے سے مُراد نٹشے ہے جو جرمنی کا مشہور فلسفی تھا اور اقبال نے کئی مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے۔
اگرچہ وہ خدا کا منکر تھا اور اس میں بھی شبہ نہیں کہ اقبال کے مردِ مومن اور نٹشے کے فوق البشر میں بعض اصولی فرق ہیں، تاہم اقبال کی رائے برابر یہ رہی ہے کہ نٹشے کا "دل مومن" تھا اور "دماغ کافر"، کبھی وہ اسے فرنگستان کا مجذوب قرار دیتے ہیں، کبھی فرماتے ہیں کہ حضرت مجدد الف ثانی جیسا مُرشد اسے مل جاتا تو نٹشے کی تمام مشکلات حل ہو جاتیں۔
ایک جگہ کہتے ہیں: کہ وہ میرے زمانے میں ہوتا تو اسے مقامِ کبریا کی حقیقت کھول کر بتا دیتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ نٹشے نے بھی اقبال کی طرح انسان کی عملی قوتوں میں حرکت پیدا کرنے کی کوشش عمر بھر جاری رکھی۔
۱۔ حکیم نطشہ توحید کا نکتہ سمجھ نہ سکا۔ لا الٰہ کے بھید سمجھنے کے لیے خاص نظر اور بصیرت کی ضرورت ہے۔ یعنی اس کا نقطۂ نگاہ اسے توحید الٰہی کو تسلیم کرنے میں کوئی مدد نہ کر سکا۔ اگر کوئی مردِ حق اسے مل جاتا تو اس کے قلب و نظر میں تبدیلی پیدا کر کے اسے توحید الٰہی کا قائل کرا دیتا۔
۲۔ اس کی بلند خیالی سینۂ آسمان کے لیے تیر اور اس کی اونچی اڑنے والی فکر سورج اور چاند کے لیے کمند کا حکم رکھتی ہے یعنی اس کے تخیل کی بلندی ایسی ہے کہ آسمان اور آفتاب و ماہتاب اس سے پناہ مانگتے ہیں۔
۳۔ اگرچہ اس کا دنیا سے بے تعلق ہونا سرشت اور فطرت میں پاکیزہ ہے لیکن اس کے باوجود وہ گناہ کی لذت کے لیے ترس رہا ہے۔
مراد یہ کہ پاکیزگیٔ فطرت کے باوجود اس کا فلسفہ اسے گناہ کی خواہشات پر قابو پانے میں مدد نہیں دے سکتا اور وہ لوگوں کے دلوں میں خوفِ خدا کا جوہر پیدا کرنے سے قاصر ہے۔

اساتذہ

۱۔ اگر سُورج سیدھے راستے سے بھٹک جائے تو اس کی روشنی بدخشاں کے لعل کی تربیت نہیں کر سکتی۔ یعنی ایسے استاد جو اسلام کی راہ سے دور ہوں، طلبہ کی صحیح تربیت کیونکر کر سکتے ہیں؟

۲۔ دنیا روایات کے جال میں پھنسی ہوئی ہے۔ درس گاہوں اور ان کے استادوں کی دوڑ دھوپ کچھ معنی نہیں رکھتی، یعنی استاد لکیر کے فقیر ہیں۔ انھیں تحقیق و اجتہاد کی ہوا تک نہیں لگی۔ تلاشِ حق ناپید ہے۔ اس صورت میں اساتذہ طلبہ کی صحیح تربیت کیا کر سکتے ہیں؟

۳۔ جو لوگ زمانے کی رہنمائی کا فرض انجام دے سکتے تھے وہ اپنے ہی زمانے کے پیرو بنے ہوئے ہیں یعنی جن لوگوں میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ کتاب و سنّت پر عمل کر کے دنیا بھر کے امام بنیں، وہ لکیر کے فقیر ہو کر دورِ حاضر کے اوہام میں پھنسے ہوئے ہیں۔ پھر ایسے لوگ کیونکر قوم کو صراطِ مستقیم پر لگا سکتے ہیں۔

غزل

صاحبِ مازاغ: اشارہ ہے سورۂ نجم کی ان آیات کی طرف: ولقد راٰہ نزلۃ اخریٰ عند سدرۃ المنتھٰی۔ عندھا جنّۃ الماوٰی۔ اذ یغشی السدرۃ ما یغشٰی۔ ما زاغ البصر وما طغٰی۔ لقد رایٰ من اٰیات ربّہ الکبریٰ۔

اور اس کو (جبریلؑ) اس نے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دیکھا ہے اترتے ہوئے ایک بار اور بھی سدرۃ المنتھٰی۔ اس کے پاس ہے بہشت آرام سے رہنے کی۔ جب چھا رہا تھا سدرہ پر جو کچھ چھا رہا تھا۔ بہکی نہیں نگاہ اور نہ حد سے

بڑھی۔ بیشک دیکھی اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں۔

ان آیتوں کے متعلق بعض مفسرین کا خیال ہے کہ یہ معراج سے متعلق ہیں۔ بہرحال **ما زاغ البصر** سے مراد ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا وہ بالکل درست تھا۔ صاحب مازاغ سے مراد حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں۔

۱۔ اسی شخص کو منزل مقصود کا کھوج مل سکتا ہے، جو اندھیری رات میں چیتے کی آنکھ کو چراغ راہ بنائے۔ یعنی مشکلات کا کتنا ہی ہجوم ہو وہ بے تکلف آگے بڑھتا جائے اور مشکلات کو سفر طے کرنے میں اپنا معاون اور مددگار بنا لے۔

بلی کی طرح چیتے کی آنکھ بھی اندھیری رات میں روشن ہوتی ہے۔ دُور سے دیکھیں تو معلوم ہو کہ چراغ جل رہا ہے۔ چیتا موذی جانور ہے۔ اس کی آنکھ کو چراغ راہ بنانے کا صاف اور واضح مطلب یہی ہے کہ انسان مشکلات سے نہ گھبرائے بلکہ ان سے فائدہ اٹھائے۔

۲۔ خدا کے آزاد اور مقبول بندے کو اس دنیا میں فراغت کا ایک لمحہ بھی نہیں ملتا۔ وہ ہر آن خدا کی رضا پوری کرنے میں لگا رہتا ہے۔ ہاں غلاموں کو بے شک خاصی فرصت مل جاتی ہے۔ اس لیے کہ ان کے سامنے کوئی خاص کام نہیں ہوتا۔

۳۔ اے مسلمان نوجوان! یورپ والوں کی ترقی اور سربلندی تیری نظروں میں چکا چوند پیدا کر رہی ہے اور تو انھیں کی پیروی میں ترقی کرنا چاہتا ہے۔ میری دعا ہے کہ حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تیری نظر کے نگہبان ہوں وہی مقدس وجود ہے، جس کی نگاہِ پاک ہمیشہ خدا کی حفاظت میں رہی۔

۴۔ عیش و عشرت کی وہ محفل جس میں شراب کے پیالے ستاروں کی طرح چمک رہے ہوں وہ زیادہ دیر کی مہمان نہیں ہوتی۔

اس شعر میں بھی نظر بظاہر اشارہ اہلِ یورپ کی طرف ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ جو قومیں عیش و عشرت میں پڑ جائیں وہ اپنا عروج و اقتدار زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکتیں۔

۵۔ اے مسلمان نوجوان! کتابوں نے تیرا ذوق اس درجہ بگاڑ دیا ہے کہ تو باد صبا سے بھی پھول کی خوشبو کا کھوج نہیں لگا سکتا۔

مراد یہ ہے کہ بادِ صبا سے تو ہر شخص کو پھول کی خوشبو کا پتا مل جاتا ہے، لیکن تیرا ذوق ہی صحیح نہ رہا اور تو قدرتی مناظر کو دیکھنے کی لذّت ہی کھو بیٹھا۔

دین و تعلیم

اغماض: چشم پوشی

۱۔ میں کعبے کے پیر دروں یعنی اسلامی پیشواؤں کے طور طریقوں سے خوب واقف ہوں۔ ان میں کتابی علم یقیناً ہوگا۔ لیکن اخلاص موجود نہیں۔ جب اخلاص موجود نہ ہو تو صاحب نظر ہونے کا دعویٰ یکسر سخن سازی اور لاف زنی ہے اور اسے کبھی درست نہ سمجھا جائے گا۔ دین میں کتابی علم کافی نہیں بلکہ علم پر عقیدہ و عمل ضروری ہے۔ اخلاص کے معنی یہی ہیں۔

۲۔ مسیحیوں نے تعلیم کا جو نظام بنا رکھا ہے، اس کے متعلق صرف یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ دین اور حسنِ اخلاق کو ختم کرنے کے لیے ایک سازش ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں دنیا سے مٹ جائیں۔

۳۔ جو قوم اپنی خودی سے انصاف نہ کر سکی اور اس کے جوہر آشکارا کرنے میں ناکام رہی وہ کبھی ابھر نہیں سکتی سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی قسمت میں محکوم و مظلوم رہنے کے سوا کچھ نہیں۔ وہ دوسروں کی غلام رہے گی اور ان کے ظلم برداشت کرنے پر مجبور ہوگی۔

۴۔ اگر افراد سے غلطیاں سرزد ہوں تو قدرت بعض اوقات ان سے چشم پوشی بھی کر لیتی ہے لیکن قوم کے گناہ کبھی معاف نہیں کرتی۔

واضح رہے کہ یہ معاملہ چنداں پیچیدہ نہیں۔ قوم کے گناہوں کا مطلب یہ ہے کہ اس کے افراد کی بہت بڑی تعداد ان گناہوں میں شریک ہو گویا جرم انفرادی ہونے کے بجائے جماعتی و قومی حیثیت اختیار کر لے۔ ایسے گناہ کیوں کر معاف ہو سکتے ہیں۔

جاوید سے

یہ تین نظمیں اقبال نے اپنے عزیز فرزند جاوید سے مخاطب ہو کر لکھی ہیں،
خطاب عام ہے اور تمام نوجوان ان نظموں کے مخاطب ہیں۔

۱

۱۔ یہ زمانہ دین کو تباہ کرنے پر تلا بیٹھا ہے۔ اس کی فطرت ہی میں کافری رچی ہوئی ہے۔

۲۔ تو بخوبی سمجھ لے کہ خدا کے سچے اور مقبول بندوں کے آستانوں پر حاضری شہنشاہوں کے درباروں میں جانے سے بہتر ہے، یعنی ہدایت کی جو دولت خدا کے بندوں کی صحبت میں مل سکتی ہے، وہ بادشاہوں کے دربار میں میسّر نہیں آسکتی۔ وہاں دنیوی دولت ضرور ہوگی، لیکن انسان کا مقصود ہدایت ہے، نہ کہ دنیوی دولت۔

۳۔ یہ جادوگری کا دور ہے۔ یہاں عیاری اور نظر کے دھوکے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ جس طبقے اور جس گروہ کو بھی دیکھو، اس کے طور طریقے جادو بھرے نظر آتے ہیں۔

۴۔ زندگی کا سرچشمہ خشک ہو گیا۔ علم اور معرفت کے جن وسیلوں سے انسانوں کے دل اور دماغ روشن ہوتے تھے، وہ کہیں نظر نہیں آتے۔ حقیقت کی جو شراب گزرے ہوئے دور میں پی جاتی تھی وہ باقی نہیں رہی۔

۵۔ مکتب اور درس گاہیں ان بزرگوں سے خالی ہو چکی ہیں جن کی نگاہیں نوجوانوں کو ادب سکھانے میں کوڑوں کا کام دیتی تھیں یعنی اب درس گاہوں میں ادب اور تربیت کی دولت بھی باقی نہیں رہی۔

۶۔ مگر تو جس گھرانے کا چشم و چراغ ہے، اس کا مذاق ابتدا سے عارفانہ چلا آتا ہے۔ وہ ہمیشہ سے معرفت میں ممتاز رہا۔ تجھے خاندان کی یہ امتیازی خصوصیت فراموش نہ کرنی چاہیے۔

۷۔ اگر توحید فطرت میں رچ گئی ہو تو کوئی فکر نہیں۔ یورپی تعلیم کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

۸۔ تو بھول کی شاخ پر چہک، جس علم سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اٹھا، لیکن یہ بنیادی نکتہ نہ بھول کہ

تیری خودی تیرا اصلی ٹھکانا ہے۔ اسی کی بدولت تو اپنے خاندان کی امتیازی حیثیت برقرار رکھ سکتا ہے۔

۹۔ آدمی وہ سمندر ہے جس کا ہر قطرہ ایک بے کنارہ سمندر کی حیثیت رکھتا ہے۔ یعنی انسان کی قوتیں اور ممکنات بے اندازہ ہیں۔ وہ اپنی خودی سے ٹھیک کام لے تو خدا جانے کیا کچھ کر دکھائے۔

۱۰۔ اگر کسان کاہل اور آرام طلب نہ ہو، ہر وقت محنت و مشقت میں لگا رہے تو ہر دانے سے لاکھ دانے بنا سکتا ہے۔ یعنی اپنے حاصل کو ترقی دینے کے لیے صحیح طریق عمل اور لگاتار محنت و مشقت لازم ہے۔

۱۱۔ اے جاوید! اے نوجوان! غافل نہ بیٹھ۔ یہ کھیل کود کا وقت نہیں۔ خدا نے انسان کو زندگی بے کار ضایع کرنے کے لیے عطا نہیں کی۔ ضروری ہے کہ علم و ہنر سیکھا جائے اور کچھ کر کے دکھایا جائے۔

۲

زیرک : دانا۔

۱۔ اگر سینے میں عشقِ حق سے بھرا ہوا دل موجود نہ ہو تو زندگی خام رہ جاتی ہے۔ اس میں پختگی نہیں آتی اس لیے کہ پختگی عشقِ حق ہی کی بدولت پیدا ہوتی ہے۔

۲۔ اگر شکار دانا، دور اندیش اور چست و چالاک ہو تو جال بچھانے والے لوگ بھی اسے پھانس نہیں سکتے۔

۳۔ آبِ حیات اسی دنیا میں موجود ہے لیکن اس کے لیے سچی پیاس ہونی چاہیے۔

آبِ حیات سے مراد ہے وہ پانی جو ہمیشہ کے لیے زندگی بخشے۔ اصطلاح میں وہ سرچشمہ مراد ہے جہاں عام روایت کے مطابق حضرت خضر علیہ السلام سکندر کو لے کر پہنچے تھے۔ حضرت خضرؑ نے اس میں سے پانی پی لیا اور ہمیشہ کی زندگی پائی، سکندر نہ پی سکا۔ اقبال کہتے ہیں کہ وہ پانی ہر اس شخص کو مل سکتا ہے جس کی پیاس سچی ہو۔ وہی اس کے لیے لگاتار جدوجہد کر سکے گا اور وہی اس تک پہنچ سکے گا۔

۴۔ غیرتِ حقیقی راستہ ہے۔ اسی کو اصطلاح میں صحیح طریقت کہتے ہیں۔ اسی سے فقیری اور درویشی درجۂ کمال پر پہنچتی ہے۔

۵۔ بیٹا! یہ ممکن نہیں کہ شہباز چکور کی وضع کے کسی پرندے کا غلام بن جائے۔ شہباز کی غیرت اس قسم کی زندگی قبول نہیں کر سکتی۔

۶۔ شاعری ایسا سرمایہ نہیں جسے نایاب سمجھا جائے۔ اس دنیا میں سینکڑوں انوری اور ہزاروں جامی گزر چکے ہیں۔
انوری اور جامی فارسی کے مشہور شاعر تھے۔ ویسے مشہور شاعر دنیا کی ہر زبان پیش کر سکتی ہے۔

۷۔ دنیا میں میری حیثیت کیا ہے؟ بس یہ کہ میں آہستہ آہستہ فریاد کرتا رہا۔ وہ کسی نے سُنی، کسی نے نہ سنی، اس لیے کہ میں چھت پر نہ کھڑا تھا۔ چھت کے نیچے ہی کھڑا آہ و فغاں میں مصروف رہا۔ چھت پر کھڑے ہو کر جو فریاد کی جائے اسے سب سُن لیتے ہیں۔

۸۔ البتہ راست گفتاری اور حق گوئی کا دامن میں نے نہ چھوڑا۔ اسی کی برکت سے دنیا کی نظروں میں مجھے عزت اور قدر و منزلت نصیب ہوئی۔

۹۔ ناموری باپ سے بیٹے کو ورثے میں نہیں ملتی۔ یہ خدا کی دین ہے، جسے چاہے دے۔

۱۰۔ دیکھ حضرت نظامی گنجوی اپنے فرزند کو کیا خوب نصیحت فرما گئے ہیں۔

۱۱۔ جہاں تجھے بزرگی کا درجہ حاصل ہونا چاہیئے، وہاں میری فرزندی سے تجھے کوئی فائدہ نہ پہنچے گا۔ یعنی بزرگی ہر انسان کے اپنے عمل و کردار پر موقوف ہے۔ یہ دوسروں کی نسبت سے حاصل نہیں ہوتی۔

۳

۱۔ صاحبِ ایمان کے لیے زندگی بڑی کٹھن ہو گئی ہے۔ اس کے دن اور رات سخت مصیبت میں گزرتے ہیں۔ وہ کیا کرے؟ دین اور حکومت دونوں جوا بن گئے ہیں۔ یعنی دین دار اور حکمران جو کچھ کر رہے ہیں۔ اس کی حیثیت جوئے سے زیادہ نہیں۔

۲۔ ایسا انسان کوئی نظر نہیں آتا، جو عمل کی شراب سے مست ہو، البتہ نری باتیں بنانے والے بہت زیادہ ہیں۔

۳۔ اگر تجھ میں ہمت ہے تو وہ فقر تلاش کر جس کا سرچشمہ حجاز ہے۔ یعنی وہ فقر جس کی تعلیم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی۔

۴۔ اس حجازی فقر سے انسان میں خدا کی شانِ بے نیازی پیدا ہو جاتی ہے، یعنی وہ خدا کے سوا کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔

۵۔ اس صاحب فقر کا مقام شہبازی چڑیا اور کبوتر کے لیے موت کا پیغام ہے۔ یعنی مردِ حق عام لوگوں پر اسی طرح غالب آسکتا ہے جس طرح شہباز چڑیا اور کبوتر پر۔

۶۔ اس فقر سے انسان کی عقل بو علی سینا اور فخر الدین رازی کے فلسفے کی تعلیم کے بغیر ہی روشن ہو جاتی ہے۔

۷۔ اگر انسان کی فطرت میں ایازی یعنی غلامی نہ ہو تو اُس فقر کی بدولت اسے سلطان محمود غزنوی کی شان و شوکت میسر آجاتی ہے۔

۸، ۹۔ تیرے جہان کا یہ اسرافیل بانسری بجانے کا شوق نہیں رکھتا بلکہ اس کی نظر ہی دنیا میں انقلاب برپا کر کے در پردہ تمام کام سنوار دیتی ہے۔ یعنی صاحبِ فقر حضرت اسرافیلؑ کی طرح صور پھونک کر دنیا کو تہ و بالا نہیں کرتا بلکہ اپنی جادو بھری نظر ہی سے ایک عالمگیر ہنگامہ پیدا کر کے مُردہ دلوں کو زندہ کر دیتا ہے۔

۱۰۔ جس شخص کو اس فقرِ غیور کی دولت مل جاتی ہے، وہ تلوار اور نیزے کے بغیر ہی مردِ غازی بن جاتا ہے۔ یعنی صاحبِ فقر نظر سے وہی کام لیتا ہے جو غازی تلوار سے۔

۱۱۔ بیٹا! خدا سے یہی فقر طلب کر کیونکہ مومن کے لیے اسی فقر میں امیری ہے۔

عورت

مردِ فرنگ

۱۔ حکیم اور دانا ہزار بار اس مسئلے کو سلجھا چکے ہیں، مگر عورت کا مسئلہ جہاں تھا، وہیں رہا۔

۲۔ اس میں عورت کا کچھ قصور نہیں۔ خرابی کی وجہ اور ہے۔ عورت کی شرافت پر تو چاند اور تارے گواہی دے رہے ہیں۔

۳۔ فرنگیوں کی معاشرت اور بود و ماند میں بیشک فساد پیدا ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یورپ کا آدمی سادہ اور کم فہم ہے۔ وہ عورت کو نہیں پہچانتا۔ یعنی عورت کی فطرت اور اس کے مقام کا مرد کو صحیح اندازہ نہیں۔

ایک سوال

۱۔ کوئی یورپ کے داناؤں سے پوچھے جن کی غلامی پر ہندوستان اور یونان فخر کرتے ہیں، یعنی یہ ملک کسی زمانے میں علم و دانش کے مرکز مانے جاتے تھے اور آج یورپ کے غلام بن گئے ہیں۔

۲۔ سوال یہ ہے کہ یورپ نے معاشرت کا جو نظام پیدا کیا، اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہ کہ مرد بے روزگار ہو گئے انھیں کار و بار ملنے کی کوئی صورت نہیں اور عورتوں کی گود بچوں سے خالی رہ گئی، یعنی اولاد پیدا کرنے سے نفرت ہو گئی

معلوم ہے کہ یورپ میں سرمایہ داری کے جس نظام نے فروغ پایا، اس میں غریب طبقوں کی حالت زیادہ سے زیادہ بگڑ گئی۔ ہر مقام پر ہزاروں لوگ بیکار نظر آنے لگے۔ اس لیے کہ انھیں کام نہ ملتا تھا۔ حکومت برطانیہ نے ایک وقت میں مجبور ہو کر بیکار لوگوں کے لیے امداد کے طور پر کچھ رقمیں مقرر کر دی تھیں۔ نئے زمانے کی

یورپی عورتیں اوّل تو اولاد کو پسند ہی نہیں کرتیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ اولاد پیدا کرنے سے عورت کی صحت اور حسن میں فرق آجاتا ہے۔ انھیں کی تقلید ہمارے ہاں کی بعض عورتیں بھی کرتی ہیں۔ پھر ایسے حالات پیش آئے کہ یورپ میں بچّوں کی پیدائش روکنے کے لیے مختلف طبّی تدبیریں یا دوائیں استعمال ہونے لگیں۔ ابتدا غالباً یوں ہوئی کہ بعض مزدوروں کی آمدنی کم تھی اور بچّے زیادہ ہوتے تھے جن کے کھانے پینے، پہننے سینے اور پڑھنے پڑھانے کے انتظامات وہ نہ کرسکتے تھے، لہٰذا ضبطِ تولید سے کام لیا گیا۔ بڑھتے بڑھتے یہ بیماری عام ہوگئی۔ اقبال کہتے ہیں کہ جس معاشرت نے مردوں کو بے کار کر دیا اور عورتوں کی گود اولاد سے خالی ہوگئی وہ معاشرت کس کام کی؟ کام کاج اور اولاد دو ہی تو اس دنیا میں زندگی کی خوشیاں ہیں تجہ معاشرت ان خوشیوں کو پامال کردے وہ یقیناً صحیح اور صالح معاشرت نہیں ہوسکتی۔

پردہ

زن و شو: بیوی اور شوہر

۱۔ آسمان نے بہت رنگ بدلے۔ اس کے طور طریقوں میں سینکڑوں تبدیلیاں پیدا ہوئیں لیکن دنیا جہاں پہلے تھی، وہیں رہی۔ اس میں کوئی فرق نہ آیا۔

۲۔ میں نے بیوی اور شوہر میں قطعاً فرق نہ دیکھا۔ کہا کرتے تھے کہ مرد بے پردہ رہتا ہے اور عورت پردے میں لیکن میں نے تو دیکھا یہ کہ عورت بھی پردے میں ہے اور مرد بھی پردے میں۔

۳۔ گویا حضرت آدم علیہ السّلام کی پوری اولاد پردے میں ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ کسی کی بھی خودی نمایاں نہیں ہوئی۔

مطلب یہ کہ جب تک انسان کی خودی نمایاں نہ ہو یہی سمجھنا چاہیے کہ وہ پردے میں بیٹھا ہے۔

خلوت

۱۔ اس زمانے کو نمایاں اور بے پردہ ہونے کی ہوس نے رسوا کر دیا۔ نگاہیں تو بے شک روشن نظر آتی ہیں، لیکن دل کا آئینہ میلا ہو گیا ہے۔ یعنی ظاہر اچھا اور باطن سراسر تاریک۔

۲۔ جب نظارے کا شوق جائز حدوں سے آگے نکل جاتا ہے تو خیالات میں ربط و جمعیت کیونکر پیدا ہو گی؟

۳۔ ابرِ بہار کے جس قطرے کو سیپی کی گود نصیب نہ ہو۔ وہ موتی نہیں بن سکتا۔

مراد یہ ہے کہ قطرے میں موتی بننے کا جوہر تو ہوتا ہے لیکن وہ جوہر اسی صورت میں بروئے کار آتا ہے کہ سیپی میں بیٹھنا اسے نصیب ہو جائے۔

۴۔ خودی کو تنہائی اور علیحدگی مل جائے تو وہ اپنی حقیقت پہچان سکتی ہے اور اسے مضبوط و مستحکم بنانے میں لگ جاتی ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ تنہائی اور علیحدگی نہ بُت خانے میں مل سکتی ہے، نہ کعبے میں۔ یعنی آج کل کسی گروہ میں تنہائی کی دولت نہیں مل سکتی، اس لیے کہ سب پر نمایاں ہونے اور منظرِ عام پر آنے کا جنون طاری ہے۔

اس نظم میں بھی خلوت کے متعلق تمام اشارے عورت ہی کی طرف ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب تک عورت میں خلوت کا ذوق پیدا نہ ہو، اس کی آغوش میں اولاد کے موتی پرورش نہیں پا سکتے، لیکن غیر مسلم تو رہے ایک طرف، خود مسلمانوں کا حال یہ ہو گیا ہے کہ عورتیں اور مرد ہر جگہ دوش بدوش رہتے ہیں۔ پھر خلوت کہاں نصیب ہو؟

عورت

مکنون: پوشیدہ۔ **دُرج:** ڈبّا **مکالمات:** لفظی معنی باہم بات چیت۔ افلاطون کی ایک تصنیف کا نام ہے جسے انگریزی میں ڈائیلاگز (DAILOGUES) کہتے ہیں۔

۱۔ اس دنیا کی تصویر میں جو رنگینی اور دلکشی نظر آتی ہے۔ وہ عورت کی برکت سے ہے۔ اسی کے ساز سے زندگی میں گرمی ہنگامہ پیدا ہوئی۔ یعنی عورت نہ ہوتی تو اس دنیا کی رونق اور چہل پہل یا زندگی کی دلکشی بھی نہ ہوتی

۲۔ عورت کی مشتِ خاک برتری میں ثریا سے بھی بلند تر ہے۔ حق یہ ہے کہ یہاں جو شرف اور برتری نظر آتی ہے وہ عورت ہی کے ڈبّے کا چھپا ہوا موتی ہے یعنی عورت ہی تمام عظمتوں، شرافتوں اور سربلندیوں کا سرچشمہ ہے۔

۳۔ بے شک عورت نے فلسفے کی کوئی ایسی کتاب نہ لکھی، جیسے افلاطون کے مکالمات ہیں لیکن اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہیے کہ افلاطون کی چنگاری بھی عورت ہی کے شعلے سے پیدا ہوئی تھی۔ یعنی افلاطون جیسے فلسفی بھی عورت ہی کی آغوش میں پرورش پا کر بلند رتبے پر پہنچے۔

آزادیٔ نسواں

معتُوب: ناراضی کا نشانہ

۱۔ میں اس بحث کا فیصلہ نہیں کر سکتا، اگرچہ خوب جانتا ہوں کہ کون سی چیز زہر ہے اور کون سی قند۔ یعنی اچھائی بُرائی کا مجھے پورا اندازہ ہے۔ لیکن میں صاف صاف کچھ کہنے کے لیے تیّار نہیں۔ کیوں؟

۲۔ اس لیے کہ نئی تہذیب کے متوالے پہلے ہی مجھ سے ناراض ہیں۔ اب اور کوئی بات کہ کر ان کی مزید ناراضگی کا نشانہ کیوں بنوں؟

۳۔ عقل مند لوگ کچھ فیصلہ کرنے میں مجبور اور معذور رہیں۔ عورت ہی کی بصیرت اس بھید کو کھول سکتی ہے بھید کیا ہے؟

۴۔ یہ کہ آرائش اور قیمت میں کون سی چیز بڑھی ہوئی ہے؟ عورتوں کی آزادی یا زمرّد کا گلوبند؟

مراد یہ ہے کہ اگر عورتیں آزادی کی طلبگار ہیں تو انھیں زیورات یا آرائش کی دوسری چیزوں سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔ مرد ان کے لیے قیمتی چیزیں لاکر دینے کے ذمّے دار نہ رہیں گے۔ وہ اسی وقت تک عورتوں کی ہر جائز خواہش کو پورا کر سکتے ہیں، جب تک عورتیں گھروں میں بیٹھی رہیں۔ اب وہی اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر فیصلہ کر لیں کہ ان کی قدر و قیمت اور آرائش آزادی سے بڑھتی ہے یا زمرّد کے گلوبند سے؟

عورت کی حفاظت

۱۔ میرے سینے میں ایک زندہ اور پائدار حقیقت چھپی ہوئی ہے لیکن جس شخص کی رگوں میں گرم لہو موجود نہیں بلکہ اس کی گرمی ختم ہو چکی ہے، وہ اس حقیقت کو کیا سمجھ سکتا ہے؟

۲۔ عورت کے عورت پن کی حفاظت صرف مرد کر سکتا ہے۔ نہ پردہ حفاظت کا یہ فرض انجام دے سکتا ہے، نہ تعلیم، خواہ وہ نئی ہو یا پرانی۔

۳۔ جو قوم اس زندہ حقیقت کو نہ پا سکی اور اس پر کاربند نہ ہو سکی۔ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کے اقبال کا سورج بہت جلد ماند پڑ جائے گا۔ یعنی وہ اوج و عروج کی بلندیوں پر قائم نہ رہ سکے گی۔

عورت اور تعلیم

امومت : ماں ہونا۔

۱۔ اگر یورپ کی تہذیب یہ ہے کہ عورت میں بچے پیدا کرنے اور ماں بننے کا جذبہ فنا ہو جائے تو سمجھنا چاہیے کہ انسان کے لیے اس تہذیب کا پھل موت کے سوا کچھ نہیں۔

۲۔ جو علم سیکھنے سے عورت اپنے حقیقی جوہر کھو بیٹھتی ہے اور اس میں عورت پن باقی نہیں رہتا۔ عقل مند اس علم کو موت قرار دیتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ ہر علم کا مقصود انسانیت کی برتری ہے۔ اگر کوئی علم عورت کی صحیح تربیت نہ کر سکے اور اس میں مردانہ خصلتیں پیدا کر دے تو اس علم کو عورت کے لیے موت کے سوا کیا سمجھا جائے گا؟

۳۔ اگر عورت کی تربیت گاہ دین کی تعلیم سے محروم رہے تو وہ جو علم و ہنر سیکھے گی، وہ عشق و محبت کے لیے موت کا پیغام ہوگا، یعنی عورت کو اس کے حقیقی فرائض سے بیگانہ بنا دے گا۔

عورت

معرکہ بود و نبود : وجود اور عدم کا میدانِ جنگ یعنی دنیا

۱۔ مرد کا جوہر کسی دوسرے کا احسان اٹھائے بغیر نمایاں ہو سکتا ہے۔ عورت کا جوہر نمایاں کرنا کسی دوسرے کا کام ہے یعنی مرد کی امداد کے بغیر عورت کا جوہر آشکار نہیں ہو سکتا ——— ۲۔ وہ محنت و مشقت اولاد کے لیے اٹھاتی ہے۔ اس کا بھید معلوم کرنا چاہو تو اس نکتۂ شوق میں معلوم کر سکتے ہو کہ لذتِ تخلیق سے اس کے وجود میں آگ سی حرارت موجود رہتی ہے، یعنی اولاد پیدا کرنے کی لذت ہی اس کی تمام محنتوں اور مشقتوں کا باعث ہے۔ قدرت نے عورت کو پیدا اسی غرض سے کیا اور زندگی میں یہی اس کا فریضہ ہے۔

۳۔ اسی حرارت سے زندگی کے بھید کھلتے جاتے ہیں۔ اسی حرارت سے وجود و عدم اور حیات و موت کا یہ معرکہ گرم ہے جسے دنیا کہتے ہیں یعنی اگر عورت کے وجود میں تخلیق کی لذت نہ ہوتی تو دنیا کا سلسلہ قائم نہ رہ سکتا ——— ۴۔ اس لحاظ سے مجھے بھی عورتوں کی مظلومی کا رنج ہے، لیکن یہ ایسی گرہ ہے جسے کھولا نہیں جا سکتا، یعنی قدرت نے اس کے لیے جو فرائض مقرر کر دیے ہیں، وہ بدلے نہیں جا سکتے۔

ادبیات و فنونِ لطیفہ

دین و ہنر

۱۔ موسیقی ہو یا شاعری، سیاست ہو یا علم، دین ہو یا ہنر (آرٹ) ان سب کے دامن میں نہایت قیمتی موتی موجود ہیں، یعنی ان میں سے کوئی بھی چیز اعلیٰ درجے کے فائدوں سے خالی نہیں۔

۲۔ ان سب چیزوں کی نمود انسان کے ضمیر سے ہوتی ہے اور ان کا ٹھکانا ستاروں سے بھی اونچا ہے۔

۳۔ اگر یہ خودی کی حفاظت کا فرض انجام دیں تو انھیں عین زندگی سمجھنا چاہیے۔ اگر یہ فرض انجام نہ دے سکیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ بیکار، فضول اور باطل ہیں۔

مراد یہ ہے کہ سب چیزیں انسانی زندگی کو پختہ اور پائدار بنانے کے لیے ہیں۔ اگر یہ اس سلسلے میں مفید ثابت ہوں تو ان کی جتنی بھی قدر و منزلت کی جائے، کم ہوگی۔ اگر مفید نہ ہوں تو آخر ان سے کیا حاصل ہے؟ دوسرے لفظوں میں اقبال فن برائے فن کے نظریے کی تردید کر رہے ہیں۔ ان کے نزدیک ہر فن کی اچھائی کا معیار یہ ہے کہ وہ مقاصد حیات میں کس حد تک مدد دے سکتا ہے۔

۴۔ جب ادب اور دین خودی سے بیگانہ ہو جائیں۔ یعنی ان میں خودی کی پرورش کا کوئی جوہر باقی نہ رہے تو قومیں آسمان کے نیچے رسوائی اور ذلت کا نشانہ بن جاتی ہیں۔ جس ادب اور دین سے قومیں اوج و عروج پر پہنچتی ہیں، وہی ہیں جو خودی کی پختگی میں مدد دیں۔

تخلیق

اس نظم میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ ارباب علم و فن کو نئی نئی چیزیں پیدا کرنی چاہئیں۔

رفاقت: دوستی، سازگاری، ساتھ۔ **ہم عناں**: ساتھی۔

۱۔ نئی دنیا نئے خیالات اور افکار سے پیدا ہوتی ہے، پتھر اور اینٹ سے دنیا پیدا نہیں کی جا سکتی۔
مراد یہ ہے کہ پتھر اور اینٹ سے نئے مکان تو بنائے جا سکتے ہیں، لیکن دنیا میں نئے نظام پیدا کرنے
کے لیے نئے افکار کی ضرورت ہے۔ نئے افکار ہی سے پرانے نظام تلپٹ ہوتے ہیں اور نئے دور کے خاکے میں رنگ
بھرے جاتے ہیں۔
۲۔ جن لوگوں نے خودی میں غوطے لگائے، انھوں نے عزم اور ہمّت کی بدولت اس چھوٹی سی ندی سے ایسے
سمندر پیدا کر لیے، جن کے کناروں کا کوئی سراغ نہ مل سکتا تھا۔ یعنی انسان کے عزم و ہمّت کی کوئی حد اور انتہا نہیں۔
۳۔ زمانے کی گردش پر وہی وجود غلبہ پا سکتا ہے۔ جو ہر سانس سے ہمیشہ کی عمر پیدا کرے۔ یعنی ایسے کارنامے
انجام دے جو اس دنیا میں برابر سورج کی طرح چمکتے رہیں اور زمانے کی کوئی گردش ان کی روشنی کو ماند نہ کر سکے۔
۴۔ ایشیا کی سرزمینوں میں جب سے خودی پر موت سی طاری ہو گئی، خدائی کے بھید جاننے والا بھی کوئی شخص
پیدا نہ ہوا، یعنی کوئی ایسی شخصیت وجود میں نہ آئی جسے خدائی کے بھید معلوم ہوتے اور وہ قوموں کو آگے بڑھا سکتے۔
۵۔ بیابان کی ہوا سے مجھے دوستی اور سازگاری کی خوشبو آ رہی ہے۔ اگر وہاں سے ساتھی مل جائیں تو اس پر تعجب
نہ ہونا چاہیے۔

جنون

زجاج گر: شیشہ بنانے والا۔

۱۔ ہماری شاعری اور مُلّائی شیشہ بنانے والوں کی دکانیں ہیں، جنھیں توڑ کر ریزہ ریزہ کر دینے کی سخت ضرورت
ہے۔ کتنا اندھیر ہے کہ دیوانہ بیابان اور آبادی میں خوار پھر رہا ہے اور ان دکانوں کو نہیں توڑتا۔
۲۔ اگر جنون کو پہاڑ اور پہاڑ کے دامن سے بیگانہ بھی کر دیا جائے تو کون جانتا ہے کہ جنون میں اور بھی کمالات
موجود ہیں، یعنی جنون صرف اسی لیے نہیں کہ پہاڑوں اور جنگلوں میں ہاؤ ہو کے نعرے لگاتا رہے وہ اور کمالات

بھی دکھا سکتا ہے۔

۳۔ درس گاہوں کا ہجوم بھی جنون کے لیے سازگار ہے۔ اس کے لیے بیابان کوئی لازمی چیز نہیں یعنی ضروری نہیں کہ صاحبِ جنون بیابانوں ہی میں چکر لگاتا رہے۔ وہ درس گاہوں میں بھی اپنے کمالات کی نمائش کر سکتا اور ان کے طور طریقے بدل سکتا ہے۔

اپنے شعر سے

۱۔ اقبالؔ اپنے شعر سے کہتے ہیں: مجھے شکایت ہے کہ تو نمائش کی لذّت پر قابو نہ پا سکا اور منظرِ عام پر آگیا جب تو فاش ہو گیا تو ساتھ ہی میرے بھید بھی فاش ہو گئے۔

۲۔ تو چنگاری کی طرح شعلے سے الگ ہوا ہے۔ اب میری آرزو یہ ہے کہ چنگاری کی طرح ادھر اُدھر بے مقصد نہ پھرتا رہ۔ کسی دردبھرے سینے میں چھپ کر بیٹھ رہنے کی جگہ تلاش کر۔

پیرس کی مسجد

۱۔ میری نظر اہلِ فرانس کے کمالِ فنِ تعمیر کی تعریف کیونکر کر سکتی ہے؟ پیرس کی یہ مسجد حق و صداقت سے یکسر خالی ہے یعنی اس خانۂ خدا کی بنیاد حق و صداقت پر نہیں رکھی گئی۔

۲۔ یہ خانۂ خدا نہیں بلکہ یورپ کے جادوگروں نے مسجد کے جسم میں بُت خانے کی روح پوشیدہ کر دی ہے، یعنی اس کی تعمیر سے ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ مسلمان فریب میں آ کر انھیں اسلام کے خیر خواہ سمجھ لیں۔

۳۔ یہ بُت خانہ انھیں ڈاکوؤں اور لٹیروں نے تعمیر کیا ہے جنھوں نے دمشق کی اینٹ سے اینٹ بجا کر رکھ

دی۔ یعنی یہ تعمیری کارنامہ انھیں دشمنان اسلام نے انجام دیا ہے جو دمشق کی تباہی و بربادی کا باعث بنے لہٰذا ان کا یہ کام کسی صورت تعریف کے لایق نہیں۔

ادبیات

۱۔ آج کل عشق کے لیے لازم ہے کہ خدا داد عقل کی پیروی کرے اور محبوب کے کوچے میں عزّت برباد نہ کرے۔ یعنی ہمیں شاعری کی دنیا میں انقلاب برپا کر دینا چاہیے اور ہجر و وصال، زلف و خال، کوچۂ جاناں وغیرہ کے مضامین ترک کر کے عقل و خرد کی راہ پر چلتے ہوئے بیدار کن اور زندگی بخش نظمیں کہنی چاہئیں۔

۲۔ عشق کو چاہیے کہ یا تو پرانے قالب میں نئی رُوح پھونک دے یا پرانی روح کو قدیم غزل گو شعرا کی پیروی سے آزاد کر دے۔ یعنی موجودہ دور کے شاعروں کو چاہیے کہ یا تو شاعری کے پرانے طریق میں نئے نئے خیالات شامل کریں یا شعر و سخن کا قدیم انداز بالکل ترک کر کے ایسی نظمیں کہیں جو قوم میں بیداری، آزادی اور زندگی کی تازہ رُوح بھر کر اسے اوجِ ترقی کے بلند مقام پر پہنچا دیں۔

نگاہ

اقبال خود فرماتے ہیں کہ یہ اشعار ریاض منزل (دولت کدہ سر راس مسعود) بھوپال میں لکھے گئے۔ اس نظم میں یہ بتایا گیا ہے کہ قدرت نے انسان کے گرد و پیش دل کشا نظاروں کے انبار لگا رکھے ہیں۔ انھیں دیکھنے کے لیے صرف نگاہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ یہی نظّارے انسان کے دل میں خالق اور پروردگار کے متعلق ایمان تازہ کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں آیا ہے۔ وَكَأَيِّنْ مِّنْ آيَةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ (اور بہت سی نشانیاں ہیں آسمانوں اور زمین میں۔ لوگ ان پر سے گزر جاتے ہیں اور ان پر دھیان

نہیں کرتے) اقبال نے ان نشانیوں میں سے کچھ اس نظم میں پیش کی ہیں۔

عماری: ہاتھی کا ہودہ۔ اونٹ کا کجاوہ۔

۱۔ بہار ہے۔ صحرائی لالے کے پھول قافلہ در قافلہ سامنے ہیں۔ جوانی کا زمانہ ہے۔ اس کی مستی دل و دماغ پر چھائی ہوئی ہے۔ دیکھنے کا ذوق موجود ہے۔ اس سے لذت اٹھائی جا سکتی ہے۔ پھر ہر شے حسن و جمال میں درجۂ کمال پر پہنچی ہوئی ہے۔

۲۔ رات کا اندھیرا ہر طرف چھا جاتا ہے تو تارے جگمگا اٹھتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ پھر سمندر کو دیکھو، اس کے ساتھ نیلے رنگ کے آسمان کی وسعت اور فراخی پر غور کرو۔

۳۔ چاندنی دلہن پر نظر ڈالو، جو رات کی عماری میں سفر کرتی ہے۔ صبح کے وقت طلوعِ آفتاب کا نظارہ حد درجہ دلکش ہوتا ہے۔ نیلے رنگ کے آسمان پر جو خاموشی سی چھائی ہوئی ہے۔ وہ بھی توجہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

۴۔ یہ سب نظارے جو حسن اور کشش میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہیں، ہر وقت سامنے رہتے ہیں۔ انھیں دیکھنے کے لیے نظر چاہیے اور دیکھنے کا معاوضہ کوئی نہیں اس لیے کہ قدرت اپنا حسن و جمال بیچتی نہیں جس کا جی چاہے اسے دیکھے اور فائدہ اٹھائے۔

مسجد قوّت الاسلام

یہ دہلی کی اس بڑی مسجد کا نام ہے، جس کی بنیاد دہلی کی فتح کے بعد سلطان قطب الدین ایبک نے رکھی۔ اس کے بعد مدت تک اس کی تعمیر کا سلسلہ جاری رہا۔ قطب مینار جو دنیا کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔ مسجد قوت الاسلام ہی کا ایک مینار یا ماذنہ تھا۔ سلطان علاءُ الدین خلجی نے اس کے مقابلے میں دوسرے مینار کی بنیاد رکھ دی لیکن وہ پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ علاءُ الدین کی یادگاروں میں سے صرف مسجد میں داخلے کا ایک دروازہ باقی ہے، جسے علائی دروازہ کہتے ہیں۔

بہرحال یہ مسجد بہ وجوہ قابلِ توجہ تھی۔ دہلی میں یہ سب سے پہلے بنی۔ اپنی اصل شان میں مکمل ہو جاتی تو

دنیا بھر میں یگانہ مسجد ثانی نہ باقی۔ نامکمل رہنے کے علاوہ بے توجہی کے باعث اس پر خاصی خستگی طاری ہے تاہم آج بھی اس کے صحن میں کھڑے ہو جائیں تو اس کے چپے چپے سے پرانی عظمت کے دور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

خجل : شرمندہ پشیمان

۱۔ میرے بے نور سینے میں اب کچھ بھی باقی نہیں۔ توحید کا نعرہ میرا سب سے عزیز سرمایہ تھا۔ اس میں اب زندگی کی کوئی رمق نظر نہیں آتی۔ وہ بالکل ٹھٹھر کر رہ گیا ہے اور اس میں آشکار ہونے کا کوئی ذوق نہیں۔
یہ اقبال کا ذاتی نقشہ نہیں بلکہ وہ ملت کے حالات کی تصویر پیش کر رہے ہیں۔

۲۔ مسلمان کی حالت اتنی بگڑ چکی ہے کہ شاید قدرت کے لیے بھی اسے پہچاننا سہل نہیں اس کی وجہ کیا ہے؟ یہ کہ غلامی اور محکومی نے سلطانی و فرماں روائی کا مقام تلپٹ کر ڈالا اور حالت کچھ سے کچھ ہو گئی۔

۳۔ اے مسجدِ قوت الاسلام! کم و بیش نو سو سال گزر جانے کے باوجود تیری مضبوطی اور پائداری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مسلمان تیری اس مضبوطی سے کیوں شرمندہ نہ ہو؟ اسے تو غلامی نے شیشے کی طرح نازک اور بے حقیقت بنا دیا۔

۴۔ تیری شان کے لائق اسی ایمان دار آدمی کی نماز ہے جس کی تکبیر حق کو قائم اور باطل کو نیست و نابود کر ڈالے۔

۵۔ مسلمان کے سانس میں پہلی سی حرارت اور پہلا سا سوز و گداز اب کہاں باقی رہا؟ اس کی نماز اور اس کا درود دونوں دل کی گرمی اور تڑپ سے بالکل خالی ہیں۔

۶۔ اس کی بانگ میں نہ بلندی ہے اور نہ شان و شکوہ۔ اے مسجدِ قوت الاسلام! کیا تو ایسے مسلمان کا سجدہ گوارا کر سکتی ہے؟

تیاتر

اس نظم میں یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ اداکار اپنا پارٹ ادا کرنے کے لیے سٹیج پر آتا ہے تو وہ کسی دوسرے کا ترجمان ہوتا ہے۔ اداکاری کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنی ہستی کو بھول جائے اور جس کا پارٹ

ادا کر رہا ہے، اس کی ہستی نمایاں کرے۔ یہ خودی کی نفی ہے اور اسے بُت پرستی کے سوا کچھ نہیں کہا جا سکتا لہٰذا مسلمان کو اس سے دور رہنا چاہیے۔

تیاتر: تھیٹر۔ تماشا گاہ۔ **معاذاللہ:** خدا کی پناہ **تمثیل:** اداکاری۔ ایکٹنگ۔

۱۔ تیرے وجود کی منزل خودی کے نور سے روشن ہے۔ زندگی کیا ہے؟ صرف خودی کے سرور، سوز اور پائداری کا دوسرا نام ہے۔

۲۔ خودی کا رتبہ چاند اور ستاروں سے بھی بلند ہے۔ خودی کے نور ہی سے انسان کی ذات اور صفات کے جوھر نمایاں ہوتے ہیں۔

۳۔ اداکاری کا مطلب کیا ہے؟ یہ کہ انسان اپنی منزل میں غیر کی خودی کو داخل کرے۔ توبہ توبہ، ایسے کام سے خدا کی پناہ۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ لات اور منات جیسے بتوں کا کاروبار پھر سے زندہ ہو جائے۔

۴۔ اداکاری کا کمال یہ ہے کہ اداکار اپنی ہستی مٹا دے اور جس کا پارٹ ادا کر رہا ہے، وہی بن جائے۔ نتیجہ کیا نکلے گا؟ یہ کہ جب اس کی ہستی ہی مٹ جائے گی تو نہ خودی کا سوز باقی رہے گا، نہ زندگی کا ساز۔ گویا اداکاری اداکار کی ہستی کو مٹا دے گی۔

شعاعِ اُمّید

۱

طوف: گرداگرد پھرنا۔ چکر لگانا

۱۔ سورج نے اپنی کرنوں سے کہا کہ دنیا عجیب چیز ہے۔ اس میں کبھی صبح ہوتی ہے کبھی شام۔

۲۔ تم مدت سے اس فضا کی وسعت میں یونہی پھر رہی ہو۔ دیکھو زمانے کی بے مہری بڑھتی ہی جا رہی ہے۔

۳۔ تم کبھی ریت کے ذرّوں کو چمکاتی ہو لیکن اس میں بھی تمہارے لیے خوشی کا کوئی سامان نہیں۔ کبھی بادِ صبا کی

طرح گلاب اور گلِ لالہ کے گرد گھومتی ہو لیکن وہاں بھی آرام نہیں ملتا۔
۴۔ میری آرزو تو یہ ہے کہ تم پھر آ کر میرے دل میں سما جاؤ جو نور کا گھر ہے، یہ باغ، یہ بیابان، یہ آبادیاں سب چھوڑ دو۔

سورج کے کہنے کا مدّعا یہ ہے کہ جب اتنی دیر سے روشنی پھیلاتے رہنے کے باوجود زمانے کی بے مہری کم نہ ہوئی تو اب کیوں یہ سلسلہ جاری رہے اور کیوں میں اپنے فیضان کے دروازے بند نہ کر دوں؟

۲

لاہوت: وہ جہان، جہاں خدا کے سوا کوئی نہیں۔ وہاں ہمیشہ خاموشی کا عالم طاری رہتا ہے۔

۱۔ آفاق کے ہر کونے سے شعاعیں اُٹھ کر بچھڑے ہوئے سورج سے بغل گیر ہونے لگیں۔
۲۔ شور مچ گیا کہ یورپ میں روشنی کی اب کوئی صورت نہیں رہی۔ اس لیے کہ مشینوں کے دھوئیں نے اس کی فضا کو سیاہ لباس پہنا دیا، یعنی مشینوں کی کثرت سے پوری فضا میں دھواں ہی دھواں نظر آتا ہے۔ اسے چیر کر سورج کی شعاعیں کیونکر زمین تک پہنچیں گی۔

مراد یہ ہے کہ یورپ کی مادہ پرستی اور مال و زر کی ہوس کے باعث اسے اپنے باطن کو روشن کی کوئی اُمّید نہیں رہی۔
۳۔ باقی رہا ایشیا تو اگرچہ وہ نظر کی لذّت سے محروم نہیں ہوا، یعنی اس میں ایمان کی کرن باقی ہے لیکن وہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک لاہوت کی طرح سنسان ہے اور اس میں کوئی ہنگامہ، کوئی جوش و خروش اور جد وجہد کی کوئی گرمی نظر نہیں آتی۔
۴۔ چنانچہ شعاعیں کہتی ہیں کہ اے دنیا کو روشن کرنے والے سورج! ہم اپنے کاروبار سے بیزار ہو چکی ہیں۔ تو ہمیں دوبارہ اپنے روشن سینے میں چھپا لے اور بھلا نہ دے۔

۳

تنویر: روشن کرنا۔ نور۔ حذر: پرہیز۔ بچاؤ۔

۱۔ اس اثنا میں ایک کرن بول اٹھی۔ اس میں حور کی نظر کی طرح شوخی بھری ہوئی تھی اور پارے کے جوہر کی طرح وہ آرام سے فارغ ہو چکی تھی۔ یعنی اسے آرام نصیب نہ تھا، بلکہ پارے کی طرح بے قرار تھی۔

۲۔ اس نے کہا کہ اے مشرق کے تاج دار! مجھے اس وقت تک روشنی پھیلانے کی اجازت دے دیجیے جب تک ایشیا کی خاک کے ایک ایک ذرے میں دنیا کو چمکانے کی صلاحیت پیدا نہ ہو جائے۔

۳۔ میں ہندوستان کی اندھیری فضا کو اس وقت تک نہ چھوڑوں گی، جب تک گہری نیند سونے والے جاگ نہ اٹھیں گے۔

۴۔ یہی سرزمین (پاک و ہند) ایشیا کی امیدوں کا مرکز ہے اور اقبال کے آنسوؤں نے اسی سرزمین کی آبیاری کی ہے۔

۵۔ چاند اور ستاروں کی آنکھیں اسی خاک سے روشن ہیں۔ یہ وہ خاک ہے جس کے ہر سنگ ریزے کو سچے موتی کی حیثیت حاصل ہے۔

۶۔ اس سرزمین سے وہ ہستیاں پیدا ہوئی ہیں جو معنی کے سمندر میں غوطے لگاتی رہیں اور جن کے لیے ہر طوفانی سمندر اتنا بے حقیقت تھا کہ اس سے پاپیادہ گزر جائیں۔

اس شعر میں ان بزرگ ہستیوں کی طرف اشارہ ہے جو ہندوستان میں بکثرت پیدا ہوئیں۔ عالم بھی، فلسفی بھی، اولیا بھی، داعیانِ حق بھی، مجدد بھی اور بڑے بڑے مذاہب کے بانی بھی۔

۷۔ جس ساز کے نغموں سے دلوں میں حرارت موجود تھی، وہی ساز اب مضراب سے محروم ہو گیا۔ یعنی ہندوستان کی پہلی حیثیت باقی نہ رہی اور اس سے روشنی کی جو کرنیں باہر اجالا کر رہی تھیں وہ خود ماند پڑ گئیں۔

۸۔ یہاں دو بڑی قومیں آباد ہیں۔ ایک ہندو، دوسری مسلمان۔ ہندو کی یہ حالت ہے کہ وہ بت خانے کے دروازے پر پڑا غافل سو رہا ہے۔ مسلمان کی یہ کیفیت ہے کہ محراب میں بیٹھا ہوا اپنی تقدیر کو رو رہا ہے۔

۹۔ بے شک یہ حالات حوصلہ افزا نہیں، لیکن میں اپنی روشنی کیوں روک لوں؟ مجھے نہ ایشیا سے بیزار ہونا چاہیے، نہ یورپ سے پرہیز میرے لیے زیبا ہے۔ مجھے تو قدرت کی طرف سے یہی اشارہ ہو رہا ہے کہ ظلمت کو اپنی روشنی سے صبح کی صورت میں بدل دوں۔

گویا حالات امید افزا نہ ہونے کے باوجود اقبال نے کرن کی زبانی امید کا پیغام دیا اور اپنے عہد کے ہندوستان کے متعلق جو کچھ فرمایا اس کی درستی میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا۔ اب ہندوستان اور پاکستان دونوں ایشیا بھر کے لیے نئی زندگی کا پیام بن سکتے ہیں۔

اُمّید

اقبال نے خود تصریح فرمائی ہے کہ یہ شعر ریاض منزل بھوپال میں لکھے گئے۔

جنود: جند کی جمع۔ فوجیں **کبود:** نیلا۔

۱۔ اگرچہ میں نہ سپاہی ہوں، نہ لشکروں کا سالار، لیکن زمانے کا مقابلہ خوب کر رہا ہوں یعنی برائیوں کے جو طوفان امڈے چلے آ رہے ہیں، ان کی روک تھام میں میں نے کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور کہہ سکتا ہوں کہ اس میں کامیاب بھی ہوا۔ اس لیے کہ میری تعلیم کی وجہ سے لوگوں کے خیالات میں انقلاب پیدا ہوا اور وہ برائیوں کے مقابلے میں دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔

۲۔ مجھے معلوم نہیں کہ جو چیز پیش کر رہا ہوں، وہ شاعری ہے یا کچھ اور؟ میں تو یہ جانتا ہوں کہ خدا نے مجھے ذکر و فکر اور جذب و سرود کی دولت عطا کی ہے۔ ذکر یہ کہ ہر وقت خدا کے احکام یاد دلانا۔ فکر یہ کہ ہر لحظہ معرفت میں غور و خوض کرتے رہنا۔ جذب یہ کہ جو کچھ کہنا، دلی کشش اور خلوص کی بنا پر کہنا۔ سرود سے مراد ہے شعر گوئی۔

۳۔ خدا کے سچے بندے کا ظاہر اور باطن ایک ہوتا ہے۔ اس کی پیشانی پر جلال کی جو شان نظر آتی ہے، وہی شان اس کی ہستی کے ضمیر میں لہریں لیتی ہے۔

۴۔ اگر خدا کا سچا بندہ حاضر اور موجود میں الجھ کر رہ جائے تو میں نہیں کہتا کہ یہ کفر ہے لیکن ظاہر ہے کہ کفر سے کم بھی نہیں۔ یعنی مرد حق کے لیے زیبا نہیں کہ جو حالات موجود ہوں وہ انھیں قبول کر کے بیٹھ جائے یا

دنیوی دلچسپیوں میں گم ہو جائے۔ اس کی شان یہی ہے کہ ہر مشکل سے بے پروا ہو کر اس دنیا کو خدا کی رضا کے مطابق چلائے۔

۵۔ اے مخاطب! تو غمگین نہ ہو۔ ابھی بہت سے دور باقی ہیں۔ یہ نیلا آسمان نئے ستاروں سے خالی نہیں ہوا۔ یعنی جو حالت اب موجود ہے، وہ ہمیشہ کے لیے باقی نہیں رہ سکتی۔ لازماً بدلے گی۔ نئے ستارے طلوع ہوں گے اور وہ اپنے ساتھ نئے دور لائیں گے۔

نگاہِ شوق

آشکارائی: ظاہر ہونا، ظہور۔ **سزاوار**: لایق **کارفرمائی**: حکومت، حکمرانی۔ **دشت پیمائی**: لفظی معنی بیابان ناپنا یعنی طے کرنا۔

۱۔ اس دنیا کے باطن میں جو کچھ ہے یہ اُسے چھپاتی نہیں۔ اس لیے کہ ذرّے ذرّے میں نمایاں ہونے کا شوق بھرا ہوا ہے۔

۲۔ اگر نگاہِ شوق بینائی کی سزاوار ہو جائے تو دنیا کا کاروبار کسی اور ہی رنگ میں نظر آئے گا۔

۳۔ یہی نگاہِ شوق ہے جس کی برکت سے محکوم قوم کے لوگ دنیا میں حکمرانی کے اہل بنے۔

۴۔ یہی نگاہِ شوق کبھی قاہری اور جبّاری کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہ اس وقت کی کیفیت ہے جب باطل کا غلبہ ہو اور اسے توڑنے کے لیے قوموں کو جلال و جبروت کی شان دکھانی پڑتی ہے۔ یعنی وہ زور و قوت لے کر باطل کے زور و قوت کو توڑتی ہیں۔ یہی نگاہِ شوق کبھی دلبری اور بانکپن کا لباس پہن لیتی ہے۔ یہ اس [illegible] ہے جب خدا کے بندوں کو آرام و اطمینان سے راہِ حق کی تعلیم و تربیت دی جاتی ہے۔ یہ قوموں کی جمالی شان [illegible] ہے۔

۵۔ اسی نگاہِ شوق کی بدو [illegible] ے کو بیابان طے کر لینے کے طور طریقے سکھا رہا ہے۔ یعنی

ہر فرد کو تعلیم دے رہا ہے کہ مشکلات کی پروا نہ کرو، ہمت اور جواں مردی سے کام لے کر انھیں ختم کردو۔
۱۰۔ اگر یہ نگاہِ شوق تجھے نصیب نہیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ تیری ہستی دل اور نظر دونوں کے لیے ذلت اور خواری کا باعث ہے۔

اہلِ ہنر سے

اسود و احمر: کالا گورا۔ **غیاب:** پوشیدہ ہونا، غیبت۔

۱۔ اے صاحبِ ہنر! سورج، چاند، مشتری وغیرہ تمام چیزوں کی چمک اور بقا تھوڑی دیر کے لیے ہے، لیکن عشق کے دم قدم سے تیری خودی کا وجود ہمیشہ قائم رہتا ہے۔ یعنی تو کائنات کی تمام چیزوں کو جو عارضی، آنی اور فانی ہیں، ترک کر کے ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والی چیز خودی کو حاصل کرنے کے لیے سرگرم جدوجہد کر۔

۲۔ تیرے کعبے کا باطن کالے گورے سے پاک ہے۔ سرخ، سفید اور نیلا رنگ تیرے لیے شرم کا مقام ہے۔ یعنی تیرا مذہب اسلام رنگ و نسل کا امتیاز روا نہیں رکھتا۔ وہ تو تمام انسانوں کے لیے مساوات اور برابری کا پیغام ہے۔

۳۔ تیری خودی جب خلوت میں ہوتی ہے تو ذکر و فکر اس کا مشغلہ ہوتا اور جب وہ منظرِ عام پر آتی ہے تو شعر اور نغمے کا لباس پہن لیتی ہے۔

۴۔ اگر تیری روح غلامی و محکومی کی آفتوں اور مصیبتوں سے کمزور ہو جائے تو تیرے ہنر کا تعلق بت خانے، بتوں کے گرد پھرنے اور انھیں سجدہ کرنے سے قائم ہو جاتا ہے۔ گویا غلامی کی حالت میں تیرا ہنر بت پرستی یعنی اغیار کی غلامی کا سبق دیتا ہے۔

۵۔ لیکن اگر تیری روح اپنی برتری و عظمت سے آگاہ ہو جائے تو انسان اور جن تیرے لشکر ہوں گے اور تو ان لشکروں کا سردار۔

غزل

تاک: انگور کی بیل

۱- اے بے خوف لہر! دریا کی تہ میں غوطہ لگانے سے موتی مل جاتے ہیں۔ لیکن کنارے کا تحفہ خس و خاشاک کے سوا کچھ نہیں ہے۔

مراد یہ ہے کہ اے مخاطب! اگر تو مقصود کا موتی حاصل کرنا چاہتا ہے تو زندگی میں آفتوں اور مصیبتوں کا مقابلہ بہادروں کی طرح کر، لیکن اگر امن و اطمینان کا طالب ہے تو محنت و مشقت کے بغیر تجھے کوڑے کرکٹ کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

۲- میں جو چنگاریاں چھوڑ رہا ہوں، ان میں بجلی کے جوہر موجود ہیں اور وہ سب کو جلا سکتی ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ تیرے سرکنڈے گیلے ہیں اور معلوم ہے کہ گیلی شے جلتی نہیں۔

۳- تو اپنے عہد کو جس طرح بنانا چاہے بنا سکتا ہے۔ اس میں ردّ و بدل تیرے اثر سے ہوگا۔ اے بے سمجھ! تو اسے آسمانوں کا اثر سمجھ رہا ہے۔

مراد یہ ہے کہ آسمان نہ کسی کا کچھ بنا سکتا اور نہ بگاڑ سکتا ہے۔ انسان کا بھروسا خدا پر ہو تو وہ ہمت و جوانمردی سے زمانے کا رُخ پھیر سکتا ہے۔

۴- میں نے جنونِ عشق کے ایسے کرشمے بھی دیکھے ہیں جن کی بدولت تقدیر کے چاک رفو ہو گئے۔ یعنی بگڑی ہوئی تقدیریں بن گئیں۔

۵- رندی کے فن میں صاحبِ کمال اسی کو سمجھا جا سکتا ہے، جس کی مستی انگور کے احسان کی محتاج نہ ہو۔ یعنی جو عام شراب پی کر مست نہ ہو بلکہ عشقِ حق کی شراب پی کر سرشار رہے۔

۶۔ ایشیا کے شراب خانے میں اب تک وہ شراب موجود ہے جس سے عقل میں روشنی پیدا ہوتی ہے
۷۔ اہلِ نظر یورپ سے اس لیے مایوس ہو گئے ہیں کہ وہاں کی قوموں کے باطن پاک نہیں رہے۔

وجود

۱۔ اے مخاطب! آسمان کے نیچے تیرا ظہور اور قیام چنگاری کی طرح ہے۔ یہ حقیقت کون تیرے ذہن میں بٹھائے کہ وجود کے کیا کیا مقام ہیں؟ یعنی دنیا کی اور سب چیزوں کے وجود عارضی اور فنا ہونے والے ہیں۔ صرف ایک انسانی وجود ایسا ہے کہ اگر انسان خودی کو درجۂ کمال پر پہنچا لے تو اس کے وجود کو ہمیشہ کی زندگی اور بقا حاصل ہو سکتی ہے۔

۲۔ اگر مصوری، شاعری اور موسیقی کے فنونِ لطیفہ میں سے کسی میں خودی کی تعمیر کا جوہر موجود نہیں تو یہ تمام فن فضول اور لاحاصل ہیں۔ یعنی ان فنون کی عظمت اسی صورت میں ہے کہ یہ انسان کی خودی پختہ کر دیں۔

۳۔ درس گاہوں اور مے خانوں میں محض فنا کا سبق دیا جاتا ہے۔ تجھے چاہیے کہ بقا کی تعلیم حاصل کرے تاکہ تو دنیا میں بھی زندگی کا بلند مقام حاصل کر سکے اور مرنے کے بعد بھی ہمیشہ کے لیے زندہ رہے۔ یعنی یہ دونوں زندگیاں تجھے جبھی مل سکتی ہیں کہ تو کسی مرشدِ کامل کے فیضِ صحبت سے بہرہ یاب ہو۔ کالجوں اور خانقاہوں میں میسّر نہیں آسکتیں۔

سرود

کے: شاہانِ عجم کے ایک خاندان کا لقب۔ اس کا بانی کیقباد تھا۔ کیکاؤس، کیخسرو اس کے مشہور بادشاہ گزرے ہیں

۱۔ دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ بانسری کے نغمے میں شراب کا سا سرور اور نشہ کہاں سے آگیا؟ یہ بانسری

بجانے والے کے دل سے اٹھا یا بانسری کی لکڑی سے پیدا ہوا؟

۲۔ اگر پہلے سوال کا جواب یہ ہو کہ بانسری کے نغمے کا سرور بجانے والے کے دل سے اٹھتا ہے تو سوچنا چاہیے کہ دل کیا چیز ہے؟ اس میں مستی اور قوت کہاں سے آتی ہے؟ کیا بات ہے کہ اس کی ایک نگاہ شاہانِ عجم کے تخت الٹ کر رکھ دیتی ہے؟

۳۔ پھر یہ امر بھی غور طلب ہے کہ قوموں کی زندگی کیوں دل کی زندگی پر موقوف ہے؟ اور کس وجہ سے اس کے حالات اور واردات لگاتار بدلتے رہتے ہیں؟

۴۔ کیا بات ہے کہ دل والے کی نگاہ میں روم، شام اور رے کی سلطنت کوئی حقیقت نہیں رکھتی؟

۵۔ جس دن نغمہ گانے والا دل کا یہ بھید پا گیا تو سمجھ لو کہ اسی دن اس کا ہنر تمام منزلیں طے کر کے درجۂ کمال پر پہنچ جائے گا۔ یعنی نغمے کی تاثیر اور اس کی کشش صرف دل کی زندگی پر موقوف ہے۔ وہی موسیقی قوموں میں زندگی کی روح کو پائندار رکھتی ہے، جس میں ہنرمند کے دلی جذبات شامل ہوں۔

نسیم و شبنم

اس نظم میں نسیم اور شبنم کا مکالمہ درج ہے۔ مضمون یہ ہے کہ اگر انسان دنیائے فانی کی دلچسپیوں میں نہ الجھے اور زندگی کا اصل مقصد پیش نظر رکھے تو یہ جہان بھی آسمانوں کا ایک بھید ہے اور اسے ٹھکانا نہ چاہیے۔

طربناک : خوشی سے بھری ہوئی۔

۱۔ نسیم شبنم سے کہتی ہے۔ میں گلاب اور گلِ لالہ کے لباس چاک کرتی رہی، لیکن تاروں کی فضا تک پہنچنا مجھے نصیب نہ ہوا۔ یعنی قدرت نے مجھ سے صرف پھول کھلانے کا کام لیا اور بلندیوں پر پہنچنے کی کوئی صورت نہ بن سکی۔

۲۔ اب میں مجبور ہو گئی ہوں کہ وطن چھوڑ دوں۔ یعنی باغ سے نکل جاؤں۔ اس لیے کہ بلبل خوشی سے بھرے ہوئے

جو نغمے گاتی ہے ان میں کوئی لذّت اور مزہ نہیں۔

۳۔ اے شبنم! قدرت نے تجھے آسمانوں کا محرم بھی بنا دیا ہے اور باغ کا بھی۔ تو مجھے بتا کہ باغ میں رہنا اچھّا ہے یا آسمانوں پر چلا جانا؟

۴۔ شبنم جواب دیتی ہے کہ اے نسیم! اگر تجھے باغ کا کوڑا کرکٹ اور گھاس پھوس اپنی طرف نہ کھینچے تو یقین رکھ کہ باغ بھی آسمان کے پردوں میں سے ایک پردہ ہے۔

اہرامِ مصر

اہرامِ مصر سے مراد وہ عظیم الشان شاہی مقبرے ہیں جو قاہرہ سے باہر چند میل پر دریائے نیل کے کنارے قائم ہیں اور جو کم و بیش پانچ ہزار سال پہلے تعمیر ہوئے تھے۔ اس پوری مدّت میں کبھی ان کی مرمّت نہ ہوئی۔ لیکن وہ بدستور موجود ہیں اور یقین ہے کہ ہزاروں سال تک اسی طرح قائم رہیں گے۔ ایک بادشاہ نے ان میں سے چھوٹے ہرم کو تڑوا کر نئی عمارت بنوانی چاہی تھی، لیکن مہینوں کی محنت کے بعد اس کا صرف پلستر اکھڑ سکا۔ جب اسے تڑوانے کا فیصلہ ہوا تو وزیر نے مشورہ دیا کہ یہ کام اچھا نہیں۔ جب بادشاہ نے مجبور ہو کر شکست و ریخت کی بندش کا حکم دیا تو وزیر نے کہا: "اب اسے ضرور تڑوا دیجئے۔ مبادا آنیوالی نسلوں کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ پہلے لوگ جو کچھ بنا گئے تھے بعد کے لوگ اسے ڈھا بھی نہ سکے، حالانکہ بنوانے کے مقابلے میں ڈھانا آسان ہوتا ہے۔"

بہر حال ان کی عظمت اور ہیبت دنیا کے لیے حیرت انگیز ہے۔

۱۔ مصر میں اہرام کے آگے جگر کو تپانے والا جو وسیع بیابان ہے، اس کی سنسان فضا میں قدرت نے صرف ریت کے ٹیلوں کا انبار لگا رکھا ہے، جنھیں تیز ہوائیں ایک جگہ سے دوسری جگہ اٹھائے پھرتی ہیں۔ اس ناپائداری میں اہرام جیسی پائدار عمارتیں بنیں۔

واضح رہے کہ مصر ایک لحاظ سے قدرت کے عجائبات کا ایک نادر نمونہ پیش کرتا ہے۔ سوڈان کی سرحد

سے قاہرہ کے قریب تک اس کی آبادی زیادہ تر نیل کے دونوں کناروں پر ہے۔ پہاڑ کی دو دیواریں متوازی چلی آتی ہیں۔ کہیں ان کا درمیانی فاصلہ دس بارہ میل ہو جاتا ہے کہیں دو چار میل رہ جاتا ہے۔ ان دیواروں کے درمیان سے نیل چلا آتا ہے۔ قاہرہ کے قریب یہ دیواریں ختم ہو جاتی ہیں اور نیل مختلف شاخوں میں بٹ کر ڈیلٹے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

ان پہاڑی دیواروں سے باہر دونوں طرف دور دور تک ریت کے ٹیلے چلے جا رہے ہیں۔ ان میں کہیں کہیں نخلستان ہیں۔ اب دریائے نیل سے نہریں نکال کر بیابان کے بعض حصوں میں آبادیوں کا انتظام ہوا ہے۔ یہ کیفیت پیشِ نظر رکھ کر شعر پر غور کیا جائے گا تو اس کا اصل مطلب بخوبی ذہن نشین ہو جائے گا

۲۔ اسی ریتیلے بیابان میں اہرام موجود ہیں، جن کی عظمت و رفعت کے آگے آسمان بھی سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ دل میں فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمیشہ قائم رہنے والی یہ تصویر کس ہاتھ نے کھینچی؟ یقیناً انسانی ہاتھ نے کھینچی لیکن وہ انسان جن کا ہنر فطرت کی غلامی سے آزاد تھا۔

۳۔ تو بھی ایسی تصویریں اگر کھینچنا چاہتا ہے تو اپنی ہنرمندی کو فطرت کی زنجیروں سے آزاد کر لے۔ ہنرمند انسان شکار کرتے ہیں، شکار ہوتے نہیں۔ ان کا طریقہ یہ نہیں کہ فطرت نے ریت کے جو تودے بنا رکھے ہیں ان کی پیروی کریں بلکہ وہ ہنرمندی کے زور سے ایسی عمارتیں بناتے ہیں، جنھیں زمانے کی کوئی گردش مٹا نہیں سکتی۔

مخلوقاتِ ہنر

۱۔ آج کل کے اربابِ ہنر اپنے کمالِ فن کے جو کارنامے پیش کرتے ہیں، وہ بظاہر نہایت خوبصورت اور دلکش نظر آتے ہیں، لیکن دیکھنے والی آنکھ پر ہنرمندوں کی دلی کیفیت آئینہ ہو جاتی ہے۔ یعنی ان کے شہکاروں میں کوئی نئی بات اور زندگی دکھائی نہیں دیتی۔

۲- ان اہلِ ہنر کے کارناموں میں نہ خودی نمایاں ہے ، نہ صبح و شام کے جہان کی گردش کا پتا چلتا ہے۔ پھر ان میں ایک دوسرے کے درمیان کھینچا تانی سے جو گرمیٔ ہنگامہ پیدا ہوتی ہے وہ بھی نظر نہیں آتی، لہٰذا ان چیزوں کے دیکھنے سے کسی میں ہمّت و جوانمردی کی کون سی اُمنگ پیدا ہو سکتی ہے؟

۳- اس بیچارے کافر پر افسوس ہے کہ وہ اب تک گزرے ہوئے زمانے کے بتوں مثلاً لات و منات کی پوجا کر رہا ہے۔ یعنی اربابِ ہنر اپنے کارناموں میں لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ نئی باتیں پیش نہیں کرتے۔ زندگی پیدا کرنے والی جدید راہیں نہیں نکالتے۔

۴- تو ایک میّت کی مانند ہے اور یہ ہنر امام بن کر تیری نمازِ جنازہ پڑھا رہا ہے۔ وہ مردہ جسے قبر کی خواب گاہ میں زندگی نظر آئی۔

مطلب یہ کہ ہندوستان کے اربابِ ہنر میں خودی ناپید ہے۔ وہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کے کارناموں میں زندگی کی روح نظر نہیں آتی۔ ان کے جذبات مردہ ہیں۔ ان کا ہنر بے جان ہے۔ ان کی مثال اس شخص کی ہے جسے قبر کے اندھیرے میں زندگی نظر آئے، یعنی بظاہر زندہ ، حقیقت میں مردہ۔

اقبال

آتش : دال

۱- بہشت میں حضرت سنائیؒ، مولانا رومؒ سے کہہ رہے تھے کہ ایشیا کے ملکوں میں ابھی تک وہی پیالہ ہے اور وہی دال۔

مراد یہ ہے کہ ایشیا مدت سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے اور اس کی حالت میں ابھی تک کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔

۲- یہ بات تو درست ہے لیکن حسین ابن منصور حلاج کا بیان ہے کہ صدیوں کے بعد آخر کار زمانے میں ایک مرد قلندر ایسا پیدا ہو گیا ہے۔ جس نے خودی کے راز سے پردہ اٹھا دیا ہے اور اس کے بھید کھول کر دکھا دیے ہیں اور وہ اقبال ہے

فنونِ لطیفہ

متلاطم: موجیں مارنے والا طوفانی

۱- اے ارباب ہنر! فن کی خوبی اور برائی جانچنے کا کمال پیدا کر لینا اچھی بات ہے لیکن اگر تمھاری نظر چیز کی اصل حقیقت کو نہیں دیکھ سکتی تو وہ نظر کس کام کی ؟

۲- فن کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ وہ صاحبِ فن میں دائمی زندگی کی جلن حرارت، تپش اور تڑپ پیدا کر دے۔ یہ خلاف اس کے اگر ہنر نے اس میں چنگاری کی طرح لمحے دو لمحے کے لیے چمک پیدا کر بھی دی تو وہ بے سود اور بیکار ہے۔

۳- اے ابرِ بہار کے قطرے! وہ سیپی کیا اور وہ موتی کیا جس سے دریا میں طوفان نہ آجائے یعنی عشقِ حق کا وہ جذبہ سراسر بے معنی ہے، جو باطل کے جہان میں انقلاب برپا کر کے لوگوں کو بیداری اور آزاد زندگی کی نعمتوں سے مالا مال نہ کر دے۔

۴- شاعر کا شعر ہو یا گانے والے کا نغمہ جس کے اثر سے سننے والے کے دل میں زندگی کی حرارت اور سوز و گداز پیدا نہ ہو، اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ وہ صبح کی ہوا کس کام کی، جس سے باغ پر شگفتگی اور زندگی کے بجائے افسردگی اور مردنی چھا جائے ؟

۵- دنیا میں قومیں معجزے کے بغیر ترقی نہیں کر سکتیں۔ اسی لیے خدا نے حضرت موسیٰؑ کو عصا عطا کیا تھا جب تک کسی ہنر میں وہ شان پیدا ہو، جو حضرت موسیٰؑ کے عصا کو حاصل تھی، اس وقت تک وہ ہنر کس کام کا ؟

صبحِ چمن

اس نظم میں پھول، شبنم اور صبح کی زبانِ حال سے زندگی کی چند حقیقتوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

۱۔ پھول شبنم سے کہتا ہے:

اے شبنم! شاید تو خیال کرتی تھی کہ میرا وطن دور ہے۔ اے آسمانوں کا پیغام لاتے لے جانے والی! نہیں، دور نہیں۔

۲۔ شبنم جواب دیتی ہے:

اے پھول! تیری یہ بات درست ہے کہ زمین آسمان سے دور نہیں، لیکن یہ راز اس وقت تک فاش نہیں ہو سکتا جب تک انسان اُن کی محنت و مشقت نہ اٹھا لے۔

۳۔ صبح دونوں سے کہتی ہے:

باغ کے صحن میں قدم رکھو تو صبح کے مانند رکھو، یہاں تک کہ سبزہ کا موتی بھی پاؤں کے نیچے آئے تو ٹوٹنے نہ پائے۔

۴۔ بے شک پہاڑوں اور جنگلوں سے بغل گیر ہوتے رہو، لیکن آسمانوں کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے

خاقانی

تحفۃ العراقین: خاقانی کی مشہور مثنوی ہے جس میں اس نے اپنے سفرِ حج کے حالات لکھے ہیں۔ چونکہ یہ سفر عراق عجم اور عراق عرب میں سے ہوا تھا، اس لیے مثنوی کا نام تحفۃ العراقین رکھا۔

قرۃ العین: لفظی معنی آنکھ کی ٹھنڈک۔ مراد مقبول، ہر دل عزیز، محبوب۔ **عالمِ مکافات:** بدلے کا جہان۔ وہ دنیا جس میں اچھے یا بُرے عمل کا اچھا یا برا بدلہ مل جاتا ہے۔ **بوالبشر:** لفظی معنی انسان کا باپ حضرت آدم علیہ السلام۔

۱، ۲۔ مثنوی تحفۃ العراقین کا مصنّف خاقانی ذوق و نظر رکھنے والے پڑھے لکھے لوگوں کا محبوب شاعر ہے۔ اس کی عقل پردوں کو چاک کرنے والی ہے اس کے سامنے تمام پردے تار تار ہو گئے۔

۳۔ معانی کا جاننے والا خاموش رہتا ہے۔ وہ لن ترانی نہیں کہتا یعنی دون کی نہیں لیتا۔ ڈینگ نہیں مارتا۔

۴۔ اے مخاطب! تو خاقانی سے دریافت کر کہ یہ خاک کا گھر یعنی دنیا کیا شے ہے؟ اس کی کیا حقیقت ہے؟ اس میں ہر لحظہ بوگوناگوں ہنگامے برپا رہتے ہیں، ان کی اصلیّت کیا ہے؟

۵۔ خاقانی اس دنیا کے رازوں سے جس میں ادلے کا بدلہ ملتا رہتا ہے، پوری طرح واقف ہے۔ اس نے اپنے ذیل کے شعر میں سو بات کی ایک بات کہ دی ہے۔ یعنی وہ چند لفظوں میں سینکڑوں نکتوں پر بھاری بات کہ گیا ہے

ایسے جہان کی بُو کا تو اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ یعنی اس کی حقیقت تو یہیں سے معلوم ہو جاتی ہے کہ ابلیس باقی ہے اور آدم علیہ السلام فوت ہو گیا ہے۔

مطلب یہ کہ قرآن کے بیان کے مطابق ابلیس کو سجدے کا حکم دیا گیا اور اس نے انکار کر دیا۔ اس منکر کو یہاں مستقل زندگی مل گئی، لیکن جس آدمؑ نے خدا کے حکموں کے سامنے سر جھکا دیا اور اس دنیا میں باری تعالیٰ کی خلافت کا

رتبہ پایا، وہ فوت ہوگیا۔ حالانکہ ادب کا بدلہ یہ تھا کہ ابلیس مرتا اور آدمؑ زندہ رہتا۔ اسی واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس دنیا کی حقیقت کیا ہے۔

رومی

چشمِ نیم باز: وہ آنکھ جو آدھی کھلی ہوئی ہو۔

۱۔ تیری آدھ کھلی آنکھ سب کچھ غلط دیکھ رہی ہے۔ تجھے اب تک کسی چیز کی حقیقت معلوم نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ خود تیری ہستی تیرے لیے ایک راز بنی ہوئی ہے۔

۲۔ اب تک تیرا نیاز اور عاجزی ناز کی حقیقت سے بے خبر ہے یعنی تجھ میں عجز و انکسار اور غلامی کی کیفیت تو نظر آتی ہے لیکن ناز، بے پروائی اور حکومت کی شان دکھائی نہیں دیتی۔ گویا تیری نماز قیام سے خالی ہے۔ قیام یعنی سینے پر ہاتھ باندھ کر خدا کی بارگاہ میں کھڑے ہونا نماز کا ایک اہم رُکن ہے۔ جس شخص میں نیاز ہو اور ناز نہ ہو، سمجھنا چاہیے کہ اس کی نماز میں قیام کا رکن موجود نہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوگیا کہ اقبال کے نزدیک نماز کے ارکان میں اللہ تعالیٰ نے کیسی کیسی مصلحتیں رکھی ہیں۔ گویا نماز اگرچہ انتہائی عجز و نیاز کی چیز ہے، تاہم اس میں ایک رکن ایسا بھی ہے جو انسان میں شانِ ناز پیدا کرتا ہے۔

۳۔ اب تک تیرے سازِ خودی کے تار ٹوٹے ہوئے ہیں کیونکہ تو مولانا روم کے نغموں سے بے پروا ہے۔ یعنی مولانائے روم نے مثنوی میں حکمت کے جو انمول موتی بکھیر دیے ہیں تو نے انھیں دامن میں نہیں چنا۔

جدّت

سیما: پیشانی

۱۔ اگر تو زمانے کو اپنی نظر سے دیکھے تو تیری صبح کی روشنی سے آسمان روشن ہو جائیں۔

مراد یہ ہے کہ اگر تو عشقِ حق میں ڈوب کر خودی کو درجۂ کمال پر پہنچالے تو تجھ میں ایسی بصیرت پیدا ہو جائے کہ جب تو کائنات پر نظر ڈالے تو زمین سے آسمان تک ساری فضا تیرے روشن افکار کے نور سے منور ہو جائے۔

۲۔ جب تجھ میں ایسی نظر پیدا ہو جائے گی تو سورج تیری چنگاری سے روشنی حاصل کرنے لگا اور چاند کی پیشانی سے تیری تقدیر ظاہر ہو گی۔

۳۔ تیرے موتی میں آب و تاب کی جو لہریں ہیں، ان سے دریاؤں اور سمندروں میں طوفان پیدا ہو جائیں۔ تیری ہنرمندی میں معجزے کی وہ شان نمایاں ہو جائے، جسے دیکھ کر فطرت بھی شرمسار ہونے لگے۔

یہ سب کچھ اسی حالت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ ہنرمند زمانے کو دوسروں کی نظر سے نہیں اپنی نظر سے دیکھنے لگے۔

۴۔ اگر تو غیروں کے افکار اور خیالات کا شکاری بن جائے تو یہ کس قدر افسوس کی بات ہے! کیا تیری پہنچ اپنی خودی تک بھی نہیں؟

مرزا بیدل

بیدل: مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی جو مغلوں کے آخری دور کا مشہور فارسی شاعر تھا۔ **کشود:** کھولنا

۱۔ یہ زمین، یہ بیابان، یہ پہاڑ اور یہ نیلا آسمان حقیقت میں موجود ہیں یا جو کچھ مجھے نظر آرہا ہے، یہ میری غلط دیکھنے والی آنکھ کا دھوکا ہے؟

۲۔ کوئی کہتا ہے کہ دنیا کا وجود نہیں، کوئی کہتا ہے کہ ہے، اب کسی کو کیا معلوم کہ حقیقت میں ہے یا نہیں؟

۳۔ میرزا بیدل نے یہ گرہ بڑی خوبی سے کھول کر رکھ دی ہے، جس کا کھولنا بڑے بڑے فلسفی اور حکیم مشکل سمجھتے رہے۔

۴۔ میرزا موصوف فرماتے ہیں: اگر دل میں زیادہ سے زیادہ کشادگی اور وسعت ہوتی تو اس باغ کا کوئی نشان نہ ملتا۔ مصیبت یہ ہے کہ دل میں کافی وسعت اور کشادگی موجود نہ تھی۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ صراحی تنگ تھی جب اس میں شراب ڈالی گئی تو رنگ نکل کر باہر بیٹھ گیا۔

مُراد یہ ہے کہ ہمیں اس دنیا کا جو بھی نشان نظر آتا ہے، اسے اپنے دل کی تنگی کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ شراب کا رنگ بیدل کے نزدیک اس لیے نظر آتا ہے کہ صراحی میں اس کے لیے جگہ نہیں ہوگی۔ گویا میرزا صاحب کے خیال کے مطابق یہ دنیا خدا کی تجلیات کا پرتو ہے۔ ہم میں یہ صلاحیت نہیں کہ تمام تجلیات کو اپنے دل میں سمیٹ لیں۔ جو تجلیات باہر رہ جاتی ہیں، وہ اس دنیا کا نشان بن جاتی ہیں۔

جلال و جمال

۱۔ میں تو اپنے لیے حضرت علی مرتضیٰؓ کے زورِ ہی کو کافی سمجھتا ہوں۔ اگر تجھے افلاطون کی تیزیٔ عقل و فکر ملی ہوئی ہے تو خدا مبارک کرے۔

۲۔ میری نظر میں جمال، حُسن اور زیبائی اسی نظارے میں ہے کہ قوت کے سامنے آسمان بھی سجدے میں گر پڑتے ہیں۔ گویا جلال بذاتِ خود جمال کا مرقع پیش کر رہا ہے۔

۳۔ اگر جلال نہ ہو تو حسن و جمال میں تاثیر کب پیدا ہو سکتی ہے؟ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر نغمے میں آگ کی حرارت نہ بھری ہو تو وہ نرا سانس رہ جاتا ہے۔

بیشک نغمہ سانس کی کشش اور قوت سے پیدا ہوتا ہے لیکن اگر اس میں وہ سُوز نہ ہو جو سننے والوں کے دلوں میں آگ لگا دے تو اس نغمے اور خالی سانس میں کیا فرق رہ جائے گا؟

۴۔ میری کیفیت تو یہ ہے کہ اگر مجھے سزا کی غرض سے دوزخ میں ڈالا جائے اور اس کی آگ کے شعلے تیز و تند، زبردست اور لپکنے والے نہ ہوں تو میں اس دوزخ کو قبول نہ کروں گا۔ گویا مجھے سزا کے لیے بھی وہی آگ درکار ہے جس میں جلال کی شان نمایاں ہو۔

اقبال کے نزدیک جلال کمال پر پہنچ جائے تو وہ جمال اور زیبائی کی شان پیدا کر لیتا ہے۔

مصوّر

بہزاد - ایک مشہور مصوّر۔

۱- خیالات کی موت کس درجہ عام ہوگئی ہے۔ ہندوستانیوں نے بھی اہل یورپ کی پیروی شروع کر دی اور ایرانیوں نے بھی۔

۲- مجھے تو یہی غم کھائے جا رہا ہے کہ ہمارے زمانے کے مصوّر اہل ایشیا کا وہ سرور بھی کھو بیٹھے ہیں جو ابتدا سے ان کا خاص جوہر سمجھا جاتا تھا یعنی ان میں وہ ادا بھی باقی نہ رہی، جو ایشیا میں لذّت و سرور کا پیغام تھی۔

۳- اسے ہنر مند! تیرے کمالات معلوم ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ تو پرانی مصوّری بھی جانتا ہے اور نئی بھی۔

۴- یہ بھی جانتے ہیں کہ تو نے قدرتی نظاروں کی تصویریں کھینچ کر دنیا کے سامنے فطرت کے راز آشکارا کیے ہیں اور خود بھی انھیں دیکھا ہے، لیکن یہ تو بتا کہ تو نے قدرت کے آئینے میں کبھی اپنی خودی بھی دکھائی ہے؟

سرودِ حلال

اس نظم میں اقبال نے یہ بتایا ہے کہ خودی کے نقطۂ نگاہ سے کون سا دل۔ دل ہے؟

مغنّی: نغمہ گانے والا۔ **بم و زیر**: پنچم مدّھم۔ اونچے اور نیچے سُر۔ **مشروع**: شریعت کی رُو سے جائز۔

۱۔ نغمہ گانے والا جب کچھ گاتا ہے تو اس کے اونچے اور نیچے سُروں سے تھوڑی دیر کے لیے دل شگفتہ تو ہو جاتا ہے، لیکن اگر یہ شگفتگی ہمیشہ کے لیے زندہ اور پائدار نہ رہے تو اسے قابلِ توجہ سمجھنا کس بنا پر جائز ہے؟
۲۔ وہ نغمہ ابھی آسمانوں کے سینوں میں چھپا ہوا ہے، جس کی گرمی سے ستاروں کا وجود پانی بن کر بہ نکلے۔
۳۔ جس کی تاثیر آدمی کو غم اور خوف کی آلایش سے پاک کر دے اور غلامی سے سلطانی کا رتبہ پیدا ہو جائے۔
غم اور خوف سے اشارہ ہے قرآن مجید کی آیت کے اس ٹکڑے کی طرف:

الآ ان اولیآء اللّٰہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ سُن رکھو، جو لوگ اللہ کے دوست ہیں، ان کے لیے نہ ڈر ہے، نہ خوف، نہ وہ غم کھاتے ہیں۔

جو نغمہ انسان کو غم اور خوف سے پاک کر دے، اس سے بڑی نعمت اس دنیا میں کیا ہو سکتی ہے؟
۴۔ وہ نغمہ ایسا ہو کہ چاند اور ستاروں کی اس بھول بھلیاں کو باقی نہ چھوڑے۔ صرف تُو باقی رہ جائے یا تیرا لاموجود الا اللہ کا زمزمہ یعنی توحید کا نعرہ۔
۵۔ خودی کے عالموں کے نزدیک یہی نغمہ جائز ہے، لیکن یہ نغمہ ابھی تک اس انتظار میں ہے کہ کوئی باکمال گانے والا پیدا ہو اور اسے گائے۔

سرودِ حرام

۱۔ میرے ذکر کرنے میں صوفیوں کا سوز اور سرور موجود نہیں۔ نہ مجھے ایسی فکر میسر ہے جسے ثواب اور عذاب کا ترازو بنا سکوں۔ یعنی نہ میں صوفیوں کی طرح سوز و سرور رکھتا ہوں نہ یہ کہتا ہوں کہ میری باتیں مانو گے تو ثواب حاصل ہوگا، نہ مانو گے تو عذاب میں مبتلا کیے جاؤ گے۔
۲۔ شہر کا عالم حدیث اور قرآن کو خوب سمجھتا ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ خدا کرے اسے میری اس گزارش سے اتفاق ہو۔

۴۔ جس نغمے میں موت کا پیغام چھپا ہوا ہو تو وہ نغمہ خواہ بانسری پر گایا جائے، خواہ چنگ پر، خواہ رباب پر، میرے نزدیک صریح حرام ہے۔ یعنی جس موسیقی سے قوم میں عمل کی روح افسردہ ہو جائے، وہ موسیقی ہر حالت میں حرام ہونی چاہیے۔ اس نظم اور اس سے پہلی نظم میں سماع کے جائز اور ناجائز ہونے کا مسئلہ بھی نہایت عمدہ انداز میں حل کر دیا۔

فوّارہ

۱۔ یہ ندی کی طرح بہنا اور خاک سے بغل گیر رہنا مجھے تو کچھ اچھا نظارہ معلوم نہ ہوا۔

مطلب یہ کہ ندّی بہتی ہے لیکن زمین کے ساتھ ساتھ رہتی ہے۔ اس سے اوپر نہیں اٹھتی۔ کیوں؟ اس لیے کہ اس کے اندر زور نہیں۔

۲۔ اے نوجوان! تو اس ندی کی طرف نہ دیکھ، اُدھر فوّارے پر نظر ڈال۔ یہ دیکھ اپنے اندرونی زور کے بل پر کتنا اوپر اٹھتا ہے!

گویا اس نظم میں ندّی کے مقابلے پر فوارے کو ترجیح دی گئی ہے، اس لیے کہ فوّارے میں اندرونی جوش زیادہ ہے۔ یہ اگرچہ جزوی امتیاز ہے، لیکن اقبال نے اس سے بھی تعلیم و تربیت کا فائدہ اٹھا لیا۔

شاعر

۱۔ ایشیا کے جنگل میں بانسری اس بات کی محتاج ہے کہ کوئی اسے پھونک کر بجائے۔ اے شاعر! تیرے سینے میں ایسا سانس ہے یا نہیں جو اس بانسری کو بجا سکے؟

۲۔ جس قوم کی خودی غلامی کے اثر سے کمزور ہو چکی ہو، اس کے لیے ایرانی لے اچھی نہیں۔ وہ اس کی خودی کو اور کمزور کر دے گی۔

۳۔ اے شاعر! تیرے پاس شیشے کی صراحی ہو یا مٹی کا مٹکا، لیکن تیری شراب تلوار کی طرح تیز ہونی چاہیے۔
مراد یہ کہ کلام کی ظاہری شان و شوکت اونچی ہو یا نہ ہو، لیکن معنی کے لحاظ سے ایسا ہونا چاہیے کہ جو بھی پڑھے، اُسے زندگی کی نئی رُوح سے سرشار ہو جائے۔

۴۔ واضح رہے کہ آسمانوں کے نیچے ایسی دنیا کوئی نہیں، جہاں لڑے بھڑے اور جد و جہد کیے بغیر ایرانی شہنشاہوں کا تخت مل سکے۔

۵۔ عشق کی راہ میں ہر لحظہ نئے طُور آتے ہیں اور ان پر تجلّی کی نئی بجلیاں چمکتی ہیں۔ خدا کرے کہ اس راہ کی منزلیں کبھی ختم نہ ہوں۔

شعرِ عجم
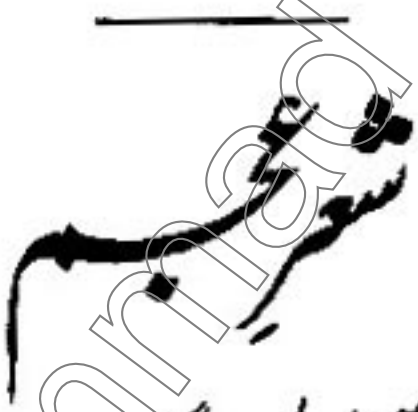
متزلزل: ڈگمگانے والی۔

۱۔ اگرچہ ایرانی شاعری بڑی پُر سرور اور دل آویز ہے، لیکن اس سے خودی کی تلوار تیز نہیں ہوتی۔

۲۔ اگر صبح کے وقت نغمے گانے والے پرندے کے نغمے سے باغ پر افسردگی چھا جائے تو اس پرندے کے لیے یہی بہتر ہے کہ چُپ رہے۔

۳۔ جس ضرب سے پرویز کی سلطنت میں زلزلہ پیدا نہ ہو وہ اگر پہاڑوں کو بھی توڑ ڈالے تو اس سے کیا حاصل ہے یعنی ہر ضرب کی حیثیت کا اندازہ اس بنا پر کیا جا سکتا ہے کہ اس سے اصل مقصد کس حد تک پورا ہوا۔ پہاڑوں کو توڑنے اور پارہ پارہ کرنے سے کیا ہاتھ آسکتا ہے؟ اصل ضرب تو وہ ہے جو شہنشاہی کا خاتمہ کر کے جمہوریت کے لیے میدان ہموار کرے۔

۴۔ اقبال! یہ پتھروں کو توڑنے کا زمانہ ہے۔ جو کچھ آئینے میں دکھاتے ہیں، اس سے بچنا چاہیے۔

مطلب یہ کہ سخت مشقت کا دور ہے۔ اس میں جانبازی اور مشقت کی تعلیم دینے کی ضرورت ہے اس کے سوا جو کچھ ہے وہ اس دور کے لیے راس نہیں، لہٰذا اس سے بچنا چاہیے۔

ہنروران ہند

اعصاب: عصب کی جمع۔ رگ پٹھے

۱۔ ہندوستان کے ہنروران کی حقیقی حیثیت واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ ان لوگوں کے خیالات عشق اور مستی کے لیے موت کا پیغام ہیں۔ ان کی اندھیری فکر میں قوموں کے مزار بنے ہوئے ہیں۔ یعنی یہ جو کچھ پیش کرتے ہیں وہ قوموں کی زندگی برباد کرنے کا باعث ہوتا ہے۔

۲۔ ان کے بت خانوں میں موت کی تصویریں پیش کی جاتی ہیں۔ یہ ایسے برہمن ہیں جن کا ہنر زندگی کی لذّت سے بیزار ہے یعنی اس میں زندگی کی کوئی خصوصیّت نظر نہیں آتی۔

۳۔ یہ اونچے مقامات کو انسان کی آنکھ سے چھپاتے ہیں۔ اس کی رُوح کو سُلا دیتے ہیں اور اس کے بدن کو جگا دیتے ہیں۔ یعنی رُوحانی قوتوں کو بے دست و پا بنا کر حیوانی قوّتوں کو جوش میں لاتے ہیں۔

۴۔ ہندوستان کے شاعر ہوں، یا مصوّر یا افسانہ نویس، افسوس کہ ان سب کے رگ پٹھوں پر عورت سوار ہے۔

یعنی یہ عورتوں کی تصویریں اور کردار ایسے انداز میں پیش کرتے ہیں جس سے لوگوں کی نفسانی خواہشات بھڑک اٹھیں۔ اسی میں ان کا کمال فن محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ لہٰذا اس سے قوم کو زندگی کا کیا سبق مل سکتا ہے؟

مردِ بزرگ

اس نظم میں اقبال نے مردِ بزرگ کی جو تصویر کھینچی ہے وہ بڑی حد تک انھیں کی تصویر ہے۔

عمیق: گہری۔ **تخلیق**: پیدا کرنا۔ **دقیق**: لفظی معنی باریک۔ نازک۔

۱۔ مومن کی نفرت بھی گہری ہوتی ہے اور محبت بھی گہری۔ اس لیے کہ وہ اپنی نفرت اور محبت کو خدا کی رضا کے تابع رکھتا ہے۔ اگر وہ کسی پر سختی بھی کرتا ہے تو اس میں شفقت کا رنگ ہوتا ہے، کیونکہ اس کی سختی سزا کے لیے نہیں بلکہ اصلاح کے لیے ہوتی ہے۔ یہ بھی خدا کی رضا کے تابع رہنے کی ایک خصوصیت ہے

۲۔ وہ اگرچہ تقلید کے اندھیرے میں پرورش پاتا ہے مگر اس کی طبیعت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ ہمیشہ نئی تجویزیں پیدا کرے۔

۳۔ وہ انجمن میں بھی بیٹھے تو اسے تنہائی کی لذّت حاصل ہوتی رہتی ہے، اس لیے کہ وہ میل جول میں زندگی کے اصلی نصب العین یعنی خدا کی رضا کو نہیں بھلاتا۔ اس کی حیثیت شمع محفل کی ہوتی ہے جو سب سے جدا بھی رہتی ہے اور روشنی کے ذریعے سے سب کی دوستی کا حق بھی ادا کرتی ہے۔

۴۔ مردِ مومن کے خیال اور فکر کی چمک دمک صبح کے سورج کی طرح ہوتی ہے۔ وہ باتیں بہت سیدھی سادی کرتا ہے، لیکن ان کے معنی بہت باریک اور نازک ہوتے ہیں۔

۵۔ اس کے دیکھنے کا انداز زمانے سے بالکل جدا ہوتا ہے۔ جو لوگ طریقت کے پیر و مرشد ہونے کے دعوے دار ہیں۔ وہ اس کے حالات سے آگاہ نہیں ہوتے۔

عالمِ نو

۱۔ جس شخص کا دل زندہ ہو اس سے تقدیر کے راز چھپے نہیں رہ سکتے۔ وہ خواب میں نئی دنیا کی تصویر دیکھتا ہے۔

۲۔ صبح کے وقت اذان کی آواز اسے جگاتی ہے تو جس دنیا کا نقشہ اس نے خواب میں دیکھا اسے بنانے اور تیار کرنے میں لگ جاتا ہے۔

۳۔ اس نئی دنیا کا بدن زندہ دل کی مٹی ہوتی ہے اور روح اس کا نعرۂ تکبیر۔

ایجادِ معانی

۱۔ اگرچہ نئے نئے معنی پیدا کرنے کی صلاحیت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتی ہے، لیکن ہنر مند آدمی کوشش سے بے پروا نہیں ہو سکتا۔ اسے لازماً لگاتار جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔

۲۔ خواجہ حافظ شیرازی کا شراب خانۂ شاعری ہو یا بہزاد مصوّر کا بُت خانۂ تصاویر، اس قسم کی چیزیں رگوں کے خون کی گرمی ہی سے نیّار ہوتی ہیں۔ یعنی ان کے لیے سخت محنت کرنی پڑتی ہے

۳۔ حق یہ ہے کہ لگاتار محنت کے بغیر کوئی بھی جوہر نہیں کھلتا۔ فرہاد کا گھر تیشے کی چنگاری کے دم سے روشن ہے۔ یعنی فرہاد نے پتھروں پر تیشہ چلایا، اس سے چنگاریاں نکلیں، یہی چنگاریاں اس کے لیے شہرت کا باعث بنیں۔ اگر فرہاد سے انجینیر یا مزدور مراد لیے جائیں تو ظاہر ہے کہ محنت کے بغیر انھیں نہ روزی مل سکتی ہے نہ شہرت۔

موسیقی

۱۔ جس نغمے کو سُن کر تیرا چہرہ روشن اور چمکیلا نہ بن جائے، سمجھ لینا چاہیے کہ وہ نغمہ غزل گانے والے کا خون ٹھنڈا ہونے کی دلیل ہے۔ یعنی حقیقی نغمہ وہی ہے جو سننے والے کے دل میں جوشِ عمل پیدا کر دے اور اسے بلند مقاصد کے لیے جدوجہد میں لگا دے۔ جس میں یہ خصوصیت نہ ہو، وہ گانے والے کی بے ہمتی اور بے جوشی کی تصویر ہوتا ہے۔

۲۔ جس بانسری بجانے والے کا ضمیر پاک نہ ہو۔ یعنی جس کی نیت اخلاص، پاکیزگی اور مقاصد کی بلندی سے خالی ہو، اس کے متعلق مان لینا چاہیے کہ وہ نغمہ نہیں گاتا بلکہ اپنے سانس کے ذریعے سے نغمے میں زہر بھرتا ہے۔

۳۔ میں مشرق اور مغرب کے لالہ زاروں میں پھر چکا ہوں۔ سب چمن میں نے دیکھے ہیں، لیکن کسی میں بھی لالے کے پھول کا گریبان چاک نہیں دیکھا۔ یعنی وہ موسیقی مجھے کہیں نہ مل سکی جو دلوں میں جوشِ عمل کی حرارت بھر دے۔

ذوقِ نظر

خوں گرفتہ: قتل کے لایق۔ **تعزیر:** سزا دینا۔

معلوم نہیں یہ کس چینی کا واقعہ ہے لیکن اقبالؔ کی زبانِ مبارک سے کئی مرتبہ یہ واقعہ سنا۔ فرمایا کرتے تھے کہ چینی عموماً موت سے بے پروا ہوتے ہیں۔ وہ قتل گاہ کی طرف اسی شان سے جاتے ہیں، جس شان

سے کوئی کسی کی دعوت میں جائے۔

۱۔ ایک چینی کو قتل کی سزا ملنے والی تھی۔ سزا جاری ہونے کے وقت اس نے جلّاد سے کہا:
۲۔ ذرا ٹھہر جا، مجھے یہ نظّارہ بہت پیارا لگتا ہے۔ میں چاہتا ہوں، ذرا تیری تلوار کی چمک دمک دیکھ لوں۔ اقبال کہتے ہیں، اس ہمّت اور بے خوفی سے واضح ہو گیا کہ اس کی خودی بہت بلند تھی۔

شعر

۱۔ میں شعر کی حقیقت سے تو واقف نہیں، لیکن اتنا جانتا ہوں کہ یہ ایک نکتہ ہے۔ قوموں کی زندگی اس کی شرح ہے۔

۲۔ جو شعر ہمیشہ کی زندگی کا پیغام ہے، وہ یا تو جبریلؑ کا نغمہ ہے یا اسرافیلؑ کی آواز۔ یعنی یا تو اس سے اسی طرح اخلاق پاکیزہ ہوتے ہیں، جس طرح حضرت جبریلؑ کے پیغام سے پاکیزہ ہوتے تھے یا وہ اسی طرح مردہ قوموں میں زندگی کی نئی رُوح پیدا کر دیتا ہے، جس طرح حضرت اسرافیلؑ کی آواز سے مردے زندہ ہو جائیں گے۔

رقص و موسیقی

اہرمن = شیطان

۱۔ شاعری سے جبریلؑ اور شیطان دونوں کی جان میں روشنی آتی ہے۔ یعنی اس سے نیک و بد دونوں کام لیے جا سکتے ہیں۔ ناچ اور گانے سے محفل میں سرور بھی پیدا ہوتا ہے اور سوز بھی۔

۲۔ ایک چینی حکیم نے فن کے بھید ان لفظوں میں فاش کیے ہیں کہ شاعری گانے کی روح ہے اور ناچ اس کا بدن۔ یعنی شعر کے سوا کوئی چیز گائی نہیں جاسکتی اور ناچ گانے کو مجسم صورت میں پیش کرتا ہے۔

ضبط

میشی: بھیڑپن۔ بزدلی۔ روباہی: لومڑی کی خصلت یعنی مکّاری۔

۱۔ دنیاداروں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ زمانے کے گلے شکوے میں لگے رہتے ہیں۔ درویشی کی شان یہ نہیں کہ زخم کھائے اور آہ کرے۔

۲۔ ایک عقل مند بوڑھے نے مجھے تنہائی میں یہ نکتہ سمجھایا کہ آہ و فریاد کو ضبط کرنا شیروں کا کام ہے اور آہ و فریاد کرنا مکّاری بھی ہے اور بزدلی بھی۔

رقص

ا۔جسمانی ناچ کے پیچ اور خم یورپ والوں کے لیے چھوڑ دے۔ روح پر رقص کی کیفیت طاری ہو تو حضرت موسیٰؑ کی ضرب پیدا ہوتی ہے۔

۲۔جسمانی رقص کا صلہ منہ اور حلق کی پیاس کے سوا کچھ نہیں اور روحانی رقص کا صلہ درویشی اور شہنشاہی ہے۔

سیاسیات مشرق و مغرب

اشتراکیت

قُلِ الْعَفْوَ: اشارہ ہے قرآن مجید کی آیت کے اس ٹکڑے کی طرف:

ویسئلونک ماذا ینفقون، قل العفو۔ تجھ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ تو کہہ دے جو بچے اپنے خرچ سے۔

اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں مسلمان کے لیے وہ سب کچھ خرچ کر دینا زیبا ہے، جو اس کی جائز ضرورتیں پوری ہونے کے بعد بچ رہتے۔

۱۔ قوموں کے طور طریقے دیکھ کر معلوم ہو جاتا ہے کہ روس سرمایہ داری کو ختم کرنے کے لیے جس تیزی سے کام لے رہا ہے، وہ فائدے سے خالی نہیں۔

۲۔ انسانی دماغ تسوخ باتیں سوچنے پر مجبور ہو گیا اور زمانے نے پرانے طریقوں سے بیزاری اختیار کر لی۔

۳۔ انسان نے جن بھیدوں کو حرص و ہوس کے خون میں چھپا رکھا تھا، معلوم ہوتا ہے کہ وہ اب آہستہ آہستہ کھل رہے ہیں۔

۴۔ اے مسلمان! تو قرآن مجید میں غور و فکر کر۔ میری دعا ہے کہ اللہ تجھے سیرت و کردار کو نئے سانچے میں ڈھالنے کی توفیق عطا فرمائے! نیا سانچا وہی ہونا چاہیئے، جو قرآن مجید نے انسانوں کے لیے پیش کیا ہے۔

۵۔ قرآن مجید کا ارشاد تھا کہ جائز ضرورتوں سے جو کچھ بچے وہ خدا کی راہ میں خرچ کر دیا جائے۔ یہ حقیقت اب تک لوگوں کی نظروں سے چھپی ہوئی ہے۔ اگر مسلمان قرآن پر عمل شروع کر دیں تو امید ہے کہ یہ حقیقت دنیا پر آشکارا ہو جائے گی اور محنت و سرمایہ کے درمیان جو کشاکش جاری ہے اس کے ختم ہونے کی صورت پیدا ہو جائے گی یا کم از کم اسلامی معاشرہ اس مصیبت سے محفوظ رہے گا۔

کارل مارکس کی آواز

کارل مارکس جرمنی کا یہودی تھا۔ ابتدا میں وہ جرمنی کے مشہور فلسفی ہیگل کا پیرو تھا۔ پھر اس کے خیالات میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا۔ وطن سے اسے نکلنا پڑا۔ عمر کے آخری ایّام انگلستان میں بسر کیے وہیں ۱۸۸۳ء میں وفات پائی۔ سرمایہ اس کی مشہور کتاب ہے، جسے کمیونسٹوں میں بہت مقبولیت حاصل ہے۔ مارکس ہی دراصل موجودہ زمانے کی اشتراکیت یا کمیونزم کا بانی ہے۔

مُہرہ بازی: لفظی معنی مُہروں سے کھیلنا۔ مُراد عیّاری۔ مکّاری۔ **مریز و کج دار:** لفظی معنی نہ گرا اور ٹیڑھا رکھ۔ اصطلاح میں ان حکموں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کا بجالانا ممکن نہ ہو۔ مطلب یہ کہ بظاہر سب کچھ دوسرے کے کاسے میں ڈالنے کی کوشش کرنا لیکن حقیقت میں کچھ نہ دینا۔

۱۔ کارل مارکس معاشیات کے ان عالموں اور فلسفیوں سے مخاطب ہے جو سرمایہ داری کے حامی ہیں۔ کہتا ہے کہ تم لوگ علم و حکمت کے مہرے تو بہت پھینکتے ہو اور بحث و تکرار کی نمائش بھی خوب کرتے ہو، لیکن اس سے حاصل کیا ہوگا؟ دنیا کا رنگ بدل گیا۔ اب اسے پرانے خیالات کی نمائش گوارا نہیں۔

۲۔ اسے معاشیات کے فلسفی! تیری کتابوں میں رکھا ہی کیا ہے۔ وہ فلسفۂ معاشیات اب کسی کی نظروں میں کیا سما سکتا ہے، جو تو سرمائے کی حمایت میں پیش کر رہا ہے۔ زمانہ بدل گیا اب اس فلسفے کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ پیچ و خم والے خطوں کا ایک مجموعہ ہے۔ اس میں مزدوروں کی ہمدردی کے دعوے تو بلاشبہ کیے جاتے ہیں، لیکن عملاً ان کے لیے کچھ کیا نہیں جاتا۔ اس قسم کی اجربہ کاریوں کو کون قابل توجہ سمجھ سکتا ہے؟

۳۔ یورپ کے بُت خانوں کو دیکھو یا کلیساؤں کو یا درس گاہوں کو، وہاں اس کے سوا کیا رکھا ہے کہ مکّار عقل اپنی نمائش سے حرص و ہوس کی خونریزیاں چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ یعنی سرمایہ داروں نے دولت سمیٹنے

کے لیے جو ہتھکنڈے اختیار کر رکھے ہیں، درس گاہوں، کلیساؤں وغیرہ میں انھیں کی تائید ہوتی ہے۔

انقلاب

۱۔ زندگی کا سوز و ساز نہ ایشیا میں ملتا ہے نہ یورپ میں۔ ایشیا میں محکومی کے باعث خودی پر موت طاری ہوگئی۔ یورپ میں لادینی اور خدا ناترسی کے باعث ضمیر مردہ ہوگئے۔ ایسی حالت میں زندگی کے سوز و ساز کی کیا امید ہو سکتی ہے؟

۲۔ دلوں میں انقلاب کا ولولہ لہریں لے رہا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس بوڑھے جہان کی موت کا وقت قریب آگیا ہے یعنی انقلاب آئے گا تو اس دنیا کا پرانا اور فرسودہ نظام بدل جائے گا۔ اور اس کی جگہ نیا نظام لے لے گا۔ اسی کا دوسرا نام پرانے جہان کی موت ہے۔

خوشامد

۱۔ اگرچہ میں دنیا کے کاموں سے واقف نہیں، لیکن ظاہر ہے کہ اہلِ نظر سے کوئی بھید چھپا نہیں رہ سکتا۔

۲۔ نیا دستور جاری ہوگیا۔ نیا دور آگیا۔ تو بھی وزیروں کی خوشامد کرکے کوئی عہدہ، منصب یا جاگیر لے لے۔

یہ نظم ۱۹۳۵ء میں لکھی گئی تھی، جب وہ دستور منظور ہو چکا تھا، جسے ہمارے ہاں صوبائی خود مختاری کا دستور کہا گیا، لیکن اس کے لیے انتخابات ۱۹۳۶ء کے آخر میں ہوئے تھے اور اپریل ۱۹۳۷ء سے وہ جاری ہوا۔ یا تو یہ سمجھنا چاہیے کہ اقبال نے اسی دستور کو سامنے رکھ کر یہ شعر کہا یا یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ شعر دو عملی کے نظام سے متعلق ہے جو ۱۹۲۱ء سے اپریل ۱۹۳۷ء تک جاری رہا۔ اس میں بھی وزیر ہوتے تھے۔

۳۔ البتہ یہ مجھے معلوم نہیں کہ اگر کوئی شخص الو کو رات کا شہباز قرار دے دے تو یہ خوشامد ہو گی یا حقیقت؟
مراد یہ ہے کہ وزیروں کو عہدے اور منصب کے لحاظ سے تو بہت بڑا سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ امر غور طلب ہے کہ آیا انھیں حقیقت میں وزیروں کے سے اختیارات حاصل ہیں کہ نہیں؟ اقبال کے نزدیک ان کی کیفیت وہی ہے جیسے الو کو رات کے وقت کا شہباز کہہ دیا جائے۔ یہ بظاہر خوشامد ہو گی، اس لیے کہ بہت بڑا لقب دے دیا گیا۔ غور سے دیکھا جائے تو حقیقت ہو گی۔

مناصب

فسونی: جس پر جادو کر دیا گیا ہو۔

۱۔ مسلمان پر فرنگیوں کا جادو چل گیا ہے اور وہ اونچے عہدوں کی خاطر یورپی حاکموں کے پیچھے پھر رہا ہے۔ یہاں تک کہ بہترین قومی اور دینی مقاصد بھی ان عہدوں کی خاطر برباد کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس سبب سے خدا مست درویش کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے ہیں۔
۲۔ خدا کرے تیرے ان اونچے عہدوں کی خیر ہو، جن کے لیے تو نے اپنی خودی کو برباد کر دیا۔
۳۔ مگر کوئی شخص یہ بات چھپانا بھی چاہے تو چھپ نہیں سکتی۔ ہر ہوش مند آدمی اسے بخوبی جانتا ہے۔
۴۔ بات یہ ہے کہ حکمران لوگ محکوموں سے صرف عقل کا جوہر خریدتے ہیں لیکن انھیں اپنی حکمرانی میں شریک نہیں کرتے یعنی حقیقی اختیارات کی باگ ڈور ان کے ہاتھ میں نہیں دیتے۔ صرف معمولی باتوں پر ٹرخا دیتے ہیں۔ مثلاً کبھی خطاب کے ایک دو حرف بڑھا دیے۔ کبھی کوئی جاگیر دے دی، کبھی کسی عزیز یا رشتہ دار کو ملازمت میں لے لیا وغیرہ۔

یورپ اور یہود

متولّی: مہتمم، نگران، انتظام کرنے والا۔

۱۔ اگرچہ یورپ میں عیش و عشرت کے سامان حد سے بڑھے ہوئے ہیں۔ وہاں حکومت بھی ہے۔ اور تجارت بھی، لیکن سینے بے نور ہیں اور دلوں کے لیے تسلی کا کوئی سہارا نہیں۔

۲۔ یورپ کی فضا کارخانوں کی مشینوں کے دھوئیں سے تاریک ہوگئی ہے۔ یہ وادی اس قابل نہیں کہ وہاں تجلی کی بارش ہو۔

۳۔ یورپ کی تہذیب پر جوانی ہی میں جاں کنی کی حالت طاری ہوگئی۔ یہ مر رہی ہے۔ گرجے باقی رہ جائیں گے۔ شاید یہودی ان کے نگران اور سرپرست بن جائیں۔ اس لیے کہ وہ دولت مند ہیں اور تمام گرجوں کو خرید سکتے ہیں۔

نفسیاتِ غلامی

رَم: بھاگنا۔ **آہو:** ہرن

۱۔ قوموں پر محکومی کا دور طاری ہو جائے تو اس وقت بھی ان میں عالم، شاعر اور فلسفی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

۲۔ مگر اللہ کے ان بندوں کا مقصد ایک ہوتا ہے۔ وہ معنی کی تشریح میں کتنے ہی درجۂ کمال پہ

پہنچ جائیں، یہ مقصد ہر وقت ان کے سامنے رہتا ہے۔

۳۔ مقصد کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ شیروں کو ہرن کی طرح مقابلے سے بھاگ نکلنے کی تعلیم دیں اور اس تعلیم کو مختلف طریقوں سے اس قدر عام کر دیں کہ شیری کی حکایت بھی نہ رہے۔

۴۔ یہ لوگ ظاہراً علمی اور دینی مسائل کی تشریح و تفسیر کرتے ہیں، لیکن حقیقت میں ان کا مدعا یہ ہوتا ہے کہ غلامی پر رضامند کر دیں۔ یعنی ان میں آزادی حاصل کرنے کی کوئی طلب باقی نہ رہ جائے۔

پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ محکومی بھی اس حقیقت کی بیسیوں مثالیں پیش کر سکتی ہے۔ مثلاً:

۱۔ مغلوں کے آخری دور میں فرنگی لٹیرے حاجیوں کے جہازوں پر بھی یورشیں کر دیتے تھے۔ یہاں کے بعض عالموں نے فتویٰ دے دیا کہ ان حالات میں حج کا سفر نہ فقط جائز ہی نہیں بلکہ گناہ ہے حالانکہ فرنگی مال و دولت کی حرص میں سات ہزار میل کا راستہ طے کر کے بحر ہند میں پہنچ گئے تھے اور مسلمان ایک اہم دینی فرض کے لیے اپنی حفاظت کا انتظام بھی کرنے کی طرف متوجہ نہ تھے۔

ب۔ جہاد کو اس بنا پر غیر شرعی قرار دیا گیا کہ اس کے لیے ایسے امام کا ہونا ضروری ہے، جس میں امامت کی تمام شرطیں جمع ہوں۔ حالانکہ ایسے امام کی ضرورت اس لیے تھی کہ جہاد کا کام بہتر طریق پہ انجام پائے۔ مدعا یہ نہ تھا کہ جب تمام شرطیں پوری کرنے والا امام موجود نہ ہو، جہاد ہی نہ کرنا چاہیے۔

ایسی اور بھی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ مسئلوں کی ایسی تشریح تھی جس کا مدعا یہ تھا کہ لوگ غلامی پر راضی ہو جائیں۔

بلشویک روس

کسر: توڑنا - **چلیپا:** صلیب - سولی - **دہریت:** خدا کا انکار - لامذہبی

۱- خدا کی مرضی کے طریقے عجیب و غریب ہیں - کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ دنیا کے ضمیر میں کون سی بات چکر لگا رہی ہے؟ اور قضا و قدر کا کارخانہ کیونکر اپنے مقاصد پورے کرتا ہے؟

۲- روس کی حالت دیکھو- جو لوگ کل تک صلیب کی حفاظت کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے تھے، وہی آج صلیب کو توڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔

بے شبہ روس زاروں کے عہد میں مسیحیت کی حفاظت کا بہت بڑا مرکز تھا، لیکن بلشویکوں کے عہد میں وہ مسیحیت ہی نہیں، تمام مذہبوں کا سب سے بڑا دشمن بن گیا۔

۳- معلوم ہوتا ہے خدا کی طرف سے لا مذہب اور دہری روس پر یہ حکم نازل ہوا ہے کہ عیسائیوں نے لات و منات جیسے جو بت بنا رکھے ہیں، ان سب کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیں۔

آج اور کل

خود افروز: اپنے آپ کو روشن کرنیوالا

۱- جو قوم آج اپنے آپ کو روشن کرنے اور محنت و مشقت سے خونِ جگر کھلانے کے لیے تیار نہیں، اسے آئندہ کل کے غم یا عیش کا کوئی حق نہیں- یعنی وہی قوم مستقبل میں عظمت کی حق دار ہے، جس کا حال

اپنے جوہروں کی نمایش اور دل سوزی سے لبریز ہو۔

۲۔ وہ قوم آنے والی کل کے ہنگامے میں شریک ہونے کے لایق نہیں سمجھی جاسکتی جس کی تقدیر میں آج کی جدوجہد نہیں۔

مشرق

مصطفیٰؒ: مصطفیٰ کمال پاشا یا کمال اتاترک جو جدید ترکی کے شہرۂ آفاق سپہ سالار تھے۔ انھیں کی کوششوں نے ترکی کو غیروں کی محکومی کے خطرے سے نجات دلائی۔ وہی ترکی جمہوریت کے پہلے صدر تھے ۱۹۳۸ء میں انتقال ہوا۔

رضا شاہ: رضا شاہ پہلوی مرحوم شاہ ایران جو معمولی حیثیت سے ترقی کرکے بادشاہی کے منصب پر پہنچے تھے

دار و رسن: دار، سُولی۔ رسن، رسّا۔ دار و رسن سے مراد ہے موت کا سامان۔

۱۔ میرے نغمے سے لالے کے پھول کا گریبان پھٹ گیا۔ صبح کی نسیم ابھی تک باغ کی تلاش میں سرگرداں پھر رہی ہے۔ یعنی اس کا کام ابھی شروع بھی نہیں ہوا۔

۲۔ ایشیا کی روح ایسے جسم کی تلاش میں تھی، جو اس کے مقاصد پورے کرسکتا۔ خیال تھا کہ مصطفیٰ کمال پاشا یا رضا شاہ پہلوی موزوں جسم کا کام دیں گے۔ اب معلوم ہوا کہ نہ اس روح نے مصطفیٰ کمال میں ظہور کیا نہ رضا شاہ پہلوی میں۔ ابھی وہ موزوں جسم کی تلاش میں لگی ہوئی ہے۔

مطلب یہ کہ ان دو عظیم الشان شخصیتوں سے جو امیدیں وابستہ کی گئی تھیں وہ پوری نہ ہوسکیں

۳۔ میں نے خودی کی تعلیم دے کر مشرقی قوموں کو بیدار کرنا چاہا۔ یہ تعلیم بھی دشمنانِ ایشیا کے نزدیک سزا کی مستحق ہے۔ زمانہ اس غرض سے سزا اسے موت کا سامان تلاش کررہا ہے۔

سیاستِ افرنگ

۱۔ اے خدا! اہلِ یورپ کی سیاست بھی تو بہ تو بہ تیری قدرت کے مقابلے کی دعوٰی دار ہے۔ لیکن تجھے تو سب چھوٹے بڑے، امیر غریب پوجتے ہیں۔ اس سیاست کے پجاری صرف امیر لوگ ہیں یا ریئس۔

۲۔ تو نے تو آگ سے فقط ابلیس پیدا کیا۔ یورپی سیاست نے مٹی سے لاکھوں ابلیس پیدا کر دیے۔

مراد یہ ہے کہ یورپی سیاست کا سارا کاروبار ابلیسی ہے۔ یہ سیاست جہاں جہاں پہنچی، اس نے انسانوں میں ابلیس کی سی خصوصیتیں پیدا کر دیں۔

خواجگی

اہلِ سجّادہ: پیری کی گدّیوں کے مالک۔ خواجگی: آقائی

۱۔ جسے موجودہ زمانہ کہا جاتا ہے، یہ حقیقت میں پرانا ہی زمانہ ہے۔ جس طرح پہلے مذہبی پیشوا، پیر اور پروہت یا وہ لوگ سردار مانے جاتے تھے، جن کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور ہوتی تھی، وہی عین بعین آج ہو رہا ہے۔

۲۔ حقیقتِ حال پر نظر رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ نہ یہ مذہبی پیشواؤں کی کرامت ہے اور نہ اسے حکومت کے زور کا نتیجہ سمجھنا چاہیے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہزاروں سال سے لوگ غلامی کے عادی چلے آتے ہیں گویا غلامی ان کی گھٹّی میں رچ گئی ہے۔ بس جو چاہے، ان پر حکومت کرتا رہے اور جدھر چاہے، انھیں چلاتا جائے۔

۳۔ جب غلاموں میں غلامی کی عادت پختہ ہو جاتی ہے تو پھر ان پر حکومت چلانے اور انھیں محکوم بنائے رکھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔

غلاموں کے لیے

۱۔ میں نے مشرق اور مغرب کے فلسفے کی کتابوں سے ایک نکتہ سیکھا ہے جو غلاموں کے لیے اکسیر کا حکم رکھتا ہے۔

۲۔ نکتہ یہ ہے کہ دین ہو یا فلسفہ، درویشی ہو یا سلطانی یہ سب چیزیں پختہ عقیدوں کی بنا پر قائم ہوتی ہیں۔ یعنی کوئی بھی کام انسان کرنا چاہے، جب تک اس کے لیے دل میں پختہ عقیدہ، پائدار یقین اور بے پناہ ہمّت پیدا نہ کر لے گا۔ کامیابی کا منہ دیکھنا مشکل ہے۔

۳۔ جس قوم کا دل پختہ عقیدوں سے خالی ہو، وہ جو کچھ کہتی ہے، بے روح اور بے جان ہوتا ہے اور جو کچھ کرتی ہے، وہ ناکام اور بے نتیجہ رہتا ہے۔

نظم کا ماحصل یہ ہے کہ جو قوم غلامی سے نجات حاصل کرنا چاہے، اس کے لیے لازم ہے کہ پہلے اپنے اندر آزادی کا یقین پیدا کرے۔ اس کے بغیر نہ اس کی تقریر و گفتار میں اثر پیدا ہوگا نہ عمل و کردار میں وہ سرگرمی رونما ہوگی جو نصب العین تک پہنچنے کے لیے لازم ہے۔

اہلِ مصر سے

ابوالہول: مصر میں اہرام کے پاس ایک بہت بڑا بُت ہے جو ایک چٹان کو تراش کر تیار کیا گیا ہے۔ اس کا دھڑ شیر کا ہے اور چہرہ انسان کا۔ انگریزی میں اسے سفنکس کہتے ہیں اور عربی میں ابوالہول۔

۱۔ ابوالہول نے یہ نکتہ مجھے سکھایا۔ وہی ابوالہول جو پرانے زمانے کے بھیدوں سے خوب واقف ہے۔

۲- نکتہ یہ ہے کہ جس چیز کی بدولت قوموں کی تقدیریں اچانک بدل جاتی ہیں، وہ قوت ہے، جس کا مقابلہ حکیموں اور داناؤں کی عقل نہیں کر سکتی۔

۳- البتہ ہر زمانے میں اس قوت کی شکلیں مختلف ہو جاتی ہیں۔ کبھی یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار بن جاتی ہے اور کبھی حضرت موسیٰؑ کا عصا، لیکن شکل بدلنے سے اس کی حقیقی حیثیت نہیں بدل سکتی گویا اہلِ مصر کو بھی قوت سے کام لیے بغیر آزادی نہیں مل سکتی۔

ابی سینیا

یہ نظم ۱۸ راگست ۱۹۳۵ء کو لکھی گئی تھی جیسا کہ اقبال نے خود تصریح کی ہے۔ اسی تاریخ کو مسولینی کی فوجوں نے ابی سینیا پر حملہ کیا تھا۔ اقبال کو یہ خبر سُن کر بے حد قلق ہوا تھا۔ ان کے سامنے یہ روشن حقیقت تھی کہ مسلمانوں نے اپنے انتہائی دورِ عروج میں مشرق و مغرب کو تہ و بالا کر ڈالا، لیکن ابی سینیا کو خفیف سا آزار بھی نہ پہنچنے دیا۔ اس لیے کہ یہ ملک مسلمانوں کے لیے سب سے پہلے پناہ گاہ بنا تھا۔ اس احسان کو مسلمان چودہ سو سال تک نہ بھولے اور اٹلی ابی سینیا کو ختم کرنے کے لیے تیار ہو گیا، حالانکہ وہاں عیسائیوں کی کثرت تھی اور حکمران بھی عیسائی تھا۔

اقبال نے اس نظم میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ عیسائیت کی آبرو اس حملے نے مٹا دی۔

کرگس: گدھ۔ **گرگ:** بھیڑیا۔ **قاش قاش:** ٹکڑے ٹکڑے۔ **برّہ:** بھیڑ کا بچہ۔

پہلا بند

یورپ کے گدھوں کو ابھی تک یہ معلوم نہیں کہ ابی سینیا کی لاش کس درجہ زہر سے بھری ہوئی ہے۔ یہ پرانا مُردہ اب ٹکڑے ٹکڑے ہونے والا ہے۔

دوسرا بند

ہو سکتا ہے، کہا جائے کہ یورپی تہذیب کمال پر پہنچ گئی اور اس نے نئے نئے علاقے فتح کر لیے، لیکن یورپ کی

شرافت زوال میں آگئی۔ حالت یہ ہے کہ اس تہذیب نے لوٹ مار کو قوموں کا ذریعۂ معاش بنا دیا ہے۔ جس
بھیڑیے کو دیکھو، وہ بھیڑ کے کسی بے گناہ بچے کی تاک میں بیٹھا ہے۔

تیسرا بند

افسوس! مسیحیت کی آبرو کا آئینہ روم نے اپنی سینیا پر حملہ کر کے سر بازار ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ اسے
مسیحیت کے پیشوا اور اسے روم کے پاپا! یہ سچائی دل کو زخموں سے چُور چُور کر دینے والی ہے۔

ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام!

اقبال نے خود تصریح فرمائی ہے کہ یہ شعر شیش محل بھوپال میں لکھے گئے۔ اس نظم میں
ابلیس کے سیاسی فرزندوں سے لفظاً اہل یورپ مراد ہیں جو مختلف حیلوں بہانوں
سے ہندوستان اور اسلامی ملکوں میں فتنوں کی آگ بھڑکا رہے تھے۔

مرغزار: چراگاہ۔ سبزہ زار۔

ختن: وسطِ ایشیا کا ایک علاقہ جہاں کے مشک والے ہرن مشہور ہیں۔

۱۔ برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں الجھا کر ان سے یہ کام لیا جا سکتا ہے کہ تمام ہندو اپنے پرانے دھرم سے الگ ہو جائیں
۲۔ مسلمان اگرچہ دنیوی مال اسباب سے بے بہرہ ہے، فاقے کاٹ رہا ہے اور موت سے نہیں ڈرتا۔ مذہب کا بدستور
پابند ہے۔ اسے مذہب سے بیگانہ بنانے کی صورت یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق اس کے دل سے
نکال دو، جسے وہ اپنے جسم کے لیے رُوح کے برابر سمجھ رہا ہے۔

۳۔ عربوں کو یورپی خیالات سکھائے جا سکتے ہیں۔ ان کی زبانوں پر وہی باتیں جاری ہونی چاہئیں جو یورپ
والے کہتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ حجاز اور یمن میں اسلام کی رُوح باقی نہ رہے گی۔
۴۔ افغانوں میں دینی غیرت بڑے زوروں پر ہے۔ اس غیرت کو ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ ملاؤں کو افغانستان

کے پہاڑوں اور وادیوں سے باہر نکال دو۔ نہ ملّا رہیں گے، نہ افغانوں کو مذہبی تعلیم دیں گے، نہ ان میں غیرت موجود رہے گی۔

۵۔ کعبے والوں سے ان کی خاص روایات چھین لو۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ مذہبی روح سے اسی طرح خالی ہو جائیں گے جس طرح ہرنوں کے نکل جانے سے ختن کے سبزہ زار خالی کیے جا سکتے ہیں۔

۶۔ اقبال شعروں کے ذریعے سے جو تلقین کر رہا ہے، اس سے مسلمانوں کے دل میں اسلام کی آگ بھڑک رہی ہے۔ ایسے گانے والے کو باغ سے نکال دینا چاہیے۔

جمعیتِ اقوام مشرق

اقبال کی ایک خواہش یہ تھی کہ مشرقی قومیں بھی اسی طرح اپنی ایک جمعیت بنالیں جس طرح پہلی جنگِ یورپ کے بعد مغربی قوموں نے بنائی تھی۔ جنیوا مغربی قوموں کی جمعیت کا مرکز تھا۔ اقبال فرمایا کرتے تھے کہ طہران مشرقی قوموں کی جمعیت کا طبعی مرکز ہے۔

ذیل کی نظم میں انھوں نے یہی خیال پیش کیا ہے۔

مسخّر تسخیر کیا گیا

۱۔ یورپ والوں نے پانی کو بھی تسخیر کرلیا ہے اور ہوا کو بھی۔ یعنی ان کے جہاز سمندروں میں بھی دوڑ رہے ہیں اور فضاؤں میں بھی اور آج ان کے مقابلے کا حوصلہ کسی کو نہیں ہو سکتا، لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ اس بوڑھے آسمان کی نگاہ بدل جائے اور وہ یورپ سے رُخ پھیر لے؟

۲۔ یورپ نے سامراج (امپیریلزم) کا جو خواب دیکھا ہے، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اس خواب کی تعبیر کچھ اور ہو جائے یعنی وہ پورا نہ ہو؟

عجیب بات یہ ہے کہ دوسری جنگِ یورپ کے بعد یورپی سامراج کے تمام نقشے پارہ پارہ ہو گئے اور

جو اس کے بچے کھچے نشان نظر آتے ہیں، وہ بھی مٹ جانے والے ہیں۔ یہ اقبالؔ کی دوربینی اور پیش بینی کی ایک عجیب وغریب کرامت ہے۔

۳۔ جس طرح مغربی قوموں نے اپنی جمعیت کا مرکز جنیوا میں بنالیا، اگر اسی طرح مشرقی قومیں اپنی ایک جمعیت بنالیں اور اس کا مرکز طہران ہو تو شاید دنیا کے کرّے کی تقدیر بدل جائے۔ یعنی مشرقی قومیں بھی اسی طرح اپنے معاملات کی مختارِ کل بن جائیں، جس طرح مغربی قومیں آج کل ہیں۔ اس طرح دنیا کی تمام قوموں کے لیے آزادی کا دروازہ کھل جائے گا۔

سلطانیِ جاوید

اعماق: عمق کی جمع۔ گہرائیاں۔

۱۔ قدرت نے مجھے بھی غور وخوض کا جوہر عطا کیا ہے۔ میں بھی سوچ بچار میں ڈوب کر تہ کی باتیں بتا سکتا ہوں، لیکن مجھے سیاست کی گہرائیوں سے ہمیشہ پرہیز رہا۔

۲۔ مگر یہ جانتا ہوں کہ قدرت کو ہمیشہ کی سلطانی پسند نہیں۔ اگرچہ یہ شعبدہ بازی بہت دلکش معلوم ہوتی ہے۔

مراد یہ ہے کہ سلطانی اور بادشاہی بلاشبہ شعبدہ بازی ہے۔ اس کا وجود صرف انسانوں کے مان لینے پر موقوف ہے۔ اگر وہ ماننے سے انکار کردیں تو ایک لمحے میں سارا طلسم ٹوٹ جائے۔ بایں ہمہ یہ شعبدہ بازی خاصی دلچسپ ہے، لیکن قدرت اسے باقی نہیں رکھنا چاہتی۔

۳۔ مثال یہ ہے کہ فرہاد نے پہاڑ کاٹا اور پتھر تراشے۔ اس کی یاد تو اب تک دلوں میں تازہ ہے، لیکن پرویز کی شہنشاہی کو کوئی بھی یاد نہیں کرتا۔ گویا یہ شخص دنیا سے ہمیشہ کے لیے مٹ گیا۔

جمہوریت

اس نظم میں اقبال نے یورپ کے ایک فلسفی کا خیال پیش کیا ہے، جیسا کہ خود تصریح فرمادی ہے۔ فارسی میں بھی انھوں نے کہا ہے: ؎

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو ✿ کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اقبال جمہوری طرزِ حکومت کے بجائے کسی اور طرزِ حکومت کو پسند فرماتے ہیں یا یہ کہ خلافتِ راشدہ کا طرزِ حکومت جمہوری نہ تھا، جیسا کہ بعض ناواقف لوگ سمجھتے ہیں۔ اقبال کے پیش نظر ان عملی برائیوں کی مذمت ہے جو آج کل کی جمہوریت میں جابجا نظر آرہی ہیں۔ یقیناً اس میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ انسانوں کے کیریکٹر، سیرت اور عقل و دانش کا اندازہ کرتے ہوئے ووٹ نہیں ڈالے جاتے، لہٰذا بعض اوقات فرومایہ اور بدسیرت لوگ سامنے آجاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ نہ عوام کی صحیح سیاسی تربیت ہوئی، نہ ان کی سیرت اور کیریکٹر معیار کے مطابق ہے۔ اگر ان کی حالت بہتر ہو جائے تو جمہوریت اپنے حقیقی مقاصد کے مطابق نتیجے پیدا کرے۔ اقبال یہی چاہتے تھے کہ اس طرزِ حکومت سے فائدہ اٹھانے کے لیے صرف لوگوں کے کیریکٹر اور سیرت پر نظر رکھی جائے یہ دیکھا جائے کہ وہ کس حد تک اصل مقاصد کی خدمت انجام دے سکتے ہیں اور کس حد تک عوام کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔

جس فرنگی فلسفی کا خیال اقبال نے نظم کیا ہے، اس کی غرض بھی غالباً یہی تھی۔

۱۔ ایک یورپی فلسفی نے یہ راز فاش کر دیا ہے۔ اگرچہ سچّی بات یہ ہے کہ دانش مند لوگ اس قسم کی باتیں کھول کر بیان نہیں کیا کرتے۔

۲۔ راز کیا ہے؟ یہ جمہوریت اس طرز حکومت کا نام ہے جس میں انسانوں کو بطور افراد گنا کرتے ہیں، ان کی اصل قدر و قیمت اور سیرت و کردار کا اندازہ نہیں کرتے۔

یورپ اور سوریا

سوریا سے مُراد ملکِ شام

مبادا کسی کو غلط فہمی ہو، یہ بتا دینا ضروری ہے کہ شام کی حدیں کسی زمانے میں بہت وسیع تھیں۔ موجودہ فلسطین (عربی و یہودی دونوں)، شرق اردن کا بڑا حصہ اور موجودہ لبنان بھی اس میں شامل تھے۔ اب مدّت سے یہ ملک فرنگیوں کی مصلحتوں کے مطابق تقسیم ہو ہو کر الگ ہو چکے ہیں۔ اور شام کی پہلی حیثیت باقی نہیں رہی۔ اقبالؔ جس شام یا سوریا کا ذکر کر رہے ہیں، اس سے سابقہ شام مراد ہے، نہ کہ موجودہ۔

عفت: پاک دامنی۔ پاکیزگی

۱۔ شام کی سرزمین نے اہلِ یورپ کو وہ پیغمبر عطا کیا جو پاکیزگی اور پاک دامنی کی دعوت دیتا تھا۔ سب کو ایک دوسرے کا غمخوار بناتا تھا اور کہتا تھا کہ کسی کو دُکھ نہ پہنچاؤ۔

اس جلیل القدر نبی سے مُراد حضرت عیسیٰؑ ہیں، جن کی دعوت کے نمایاں پہلو یہی تھے، جو اقبالؔ نے تین لفظوں میں پیش کر دیے یعنی پاکیزگی، غم خواری اور کم آزاری۔ آخر الذکر وصف کے متعلق حضرت عیسیٰؑ کے یہ مشہور ارشادات سب کو معلوم ہیں کہ "اگر کوئی تیرے ایک گال پر تھپیڑا مارے تو دوسرا بھی اس کے آگے کر دے۔ اگر کوئی تجھے بیگار میں پکڑ کر ایک کوس لے جائے تو دو کوس اس کے ساتھ چلا جا۔"

۲۔ اس نبیؑ کے بدلے میں یورپ نے شام کو کیا دیا؟ اوّل شراب، دوم جُوا، سوم بازاری عورتوں کی کثرت۔

یہ تمام چیزیں شام میں اس وقت سے شروع ہوئیں جب یورپی قومیں اس ملک کے ساحلی شہروں میں پہنچیں۔ پہلی جنگ یورپ کے بعد شام پر فرانس نے قبضہ جما لیا تو ان چیزوں کی کثرت انتہائی درجے پر پہنچ گئی۔ بیروت آج بھی فرانس کے بدترین اخلاق کا ایک نہایت افسوس ناک نمونہ پیش کر رہا ہے۔

مسولینی

یہ نظم اقبال نے ۲۲ اگست ۱۹۳۵ء کو شیش محل بھوپال میں لکھی۔ اس زمانے میں مسولینی نے ابی سینیا پر حملہ کر رکھا تھا۔ یورپی حکومتوں میں مسولینی پر لے دے ہو رہی تھی۔ اُس وقت کی جمعیتِ اقوام کے پاس یہ مسئلہ پہنچا یا گیا اور بعض ایسی قراردادیں منظور کرائی گئیں، جن میں اٹلی سے ایک حد تک تعلق توڑا گیا تھا۔ اقبال نے اس نظم میں مسولینی کی حمایت نہیں کی، بلکہ اس کی زبان سے یورپی سامراج کی مذمت کرائی ہے اور اس مذمت کا مستحق وہ خود بھی ٹھہرا ہے، جیسا کہ نظم کے آخری شعر سے بالکل ظاہر ہے ——————— **خیام : خیمہ کی جمع**

۱۔ مسولینی کا خطاب اپنے مشرقی اور مغربی حریفوں سے ہے، یعنی ان حکومتوں سے جو اٹلی کے مشرق اور مغرب میں واقع تھیں اور جو مسولینی کے سامراجی منصوبوں کو بُرا بتا رہی تھیں۔ وہ کہتا ہے: کیا مسولینی کا جرم زمانہ بھر سے نرالا ہے؟ کیا میں نے سامراج کے راستے میں قدم رکھ کر کوئی خاص گناہ کیا ہے، جو تم نہیں کر چکے؟ پھر یورپ کی ان قوموں کا مزاج خواہ مخواہ کیوں برہم ہو رہا ہے جو ہر لحاظ سے گنہگار رہیں اور آج دنیا کے سامنے پاک دامن بن رہی ہیں؟

۲۔ اگر میں اپنی سلطنت کے حدود بڑھانا چاہتا ہوں تو ان حکومتوں کو کیوں بُرا لگتا ہے جو مجھ سے بہت پہلے یہ کام انجام دے چکی ہیں؟ اگر مجھے چھاج کہا جائے تو انھیں چھلنی کہہ لو۔ ہم سب یورپی تہذیب کے آلۂ کار ہیں اور ہم میں اصولی فرق کوئی نہیں۔

۳۔ میرے دماغ پر شہنشاہی کا جو نشہ چھایا ہوا ہے، اسے تم برا بتا رہے ہو۔ میں پوچھتا ہوں کہ کیا تم کمزور قوموں کی آزادی کے شیشے چکنا چُور نہیں کر چکے؟

۴۔ یہ عجیب و غریب شعبدہ کس کی شہنشاہی نے ایجاد کیا ہے؟ حکومت کے مرکز کو راج دھانی کہا جاتا ہے، مگر نہ راجا باقی ہے، نہ راج۔

اس شعر میں اشارہ دلّی اور انگریزی حکومت کی طرف ہے۔ کہتا ہے کہ انگریز قوم کو دیکھو، اس کی شہنشاہی نے کیا کیا ہتھکنڈے ایجاد کیے ہیں؟ اس نے نہ راجے چھوڑے، نہ ان کے راج، لیکن راجدھانی کا لفظ اب تک بولا جا رہا ہے۔

۵۔ کیا تمھارا مدعا یہ ہے کہ جولیئس سیزر کی قوم گانے بجانے کے سامانوں میں لگی رہے اور بانسری کی لکڑی کو پانی دیتی رہے اور تم لوگ دنیا کے ویرانوں سے بھی خراج وصول کر لو؟

جولیئس سیزر اٹلی کا وہ شہرہ آفاق جرنیل تھا جس کے ہم پایہ سکندر اور نپولین کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ قوم نے اسے تاج پہنانے کا فیصلہ کر لیا تھا، لیکن وہ تاج پوشی سے پہلے مارا گیا۔ اس کے بھانجے آکٹیویس نے روما پر قبضہ کر لیا اور تمام حریفوں کو شکست دے کر آگسٹس کے نام سے شہنشاہ بن گیا۔ سیزر کا لقب ان شہنشاہوں نے اختیار کر لیا تھا۔ آلِ سیزر سے مراد اہل اٹلی ہیں۔ گانے بجانے اور کھانا پکانے میں انھیں یورپ کی تمام قوموں پر فوقیت حاصل ہے۔ مسولینی نے اٹلی والوں کی اس عادت کو بدل کر انھیں سپاہی بنانے کی کوشش کی، لیکن دوسری جنگِ یورپ میں ثابت ہو گیا کہ مسولینی کی یہ کوشش ایسی تھی جیسے پانی پر خط کھینچا جائے۔

۶۔ تم نے بیابان میں رہنے والے بے مایہ لوگوں کے خیمے لوٹے۔ تم نے کاشت کاروں کی کھیتیوں پر قبضہ کر لیا۔ تم نے مختلف قوموں کے تاج و تخت اُلٹ کر رکھ دیے۔

۷۔ تم لوگ پہلے تہذیب کے پردے میں لوٹ مار کرتے اور آدمیوں کو تلوار کے گھاٹ اُتارتے رہے۔ میں آج وہی کام انجام دے رہا ہوں۔ اگر یہ تمھارے لیے جائز تھا، تو میرے لیے کیوں ناجائز ہو گیا؟ یعنی ہم سب یکساں لعنت کے سزاوار ہیں۔

کلہ

۱۔ کچھ معلوم نہیں کہ ہندوستان کی قسمت میں کیا لکھا ہے؟ وہ غریب اب تک تو انگریزی تاج کا ایک چمکیلا موتی ہے۔

۲۔ اس ملک کے دہقان کو دیکھو۔ ایسا معلوم ہو گا، جیسے ابھی قبر نے کوئی مردہ اگل کر باہر پھینک دیا ہے اور

اس کا گلا سڑا کفن زمین کے نیچے ہی رہ گیا ہے۔

مراد یہ ہے نہ کسان کو کھانے کے لیے کچھ ملتا ہے ، نہ پہننے کے لیے اور اس کی حالتِ زار کسی تشریح کی محتاج نہیں۔

۳۔ اس کی جان بھی غیر کے پاس رہن ہے اور بدن بھی۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ نہ مکان باقی رہا نہ مکین۔

۴۔ لیکن مجھے تو یورپ سے بھی کوئی شکایت نہیں صرف اپنے اہل وطن سے شکایت ہے کہ وہ یورپ کی غلامی پر راضی ہو گئے۔

انتداب

انتداب : لفظی معنی قائم مقامی۔ اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک حکومت کسی ملک کا انتظام اس غرض سے سنبھال لے کہ اس کی انتظامی حالت درست کرے گی۔ اور وہاں کے رہنے والوں کو مہذب بنائے گی۔ جب دیکھے گی کہ لوگ انتظامی ذمہ داریاں سنبھالنے کے قابل بن گئے ہیں تو انتظام ان کے حوالے کر دے۔ اسے حکم داری بھی کہتے ہیں۔ دوسرے ملکوں پر تسلط کا یہ طریقہ پہلی جنگِ یورپ کے بعد اختیار کیا گیا۔ مثلاً فلسطین و عراق کی قائم مقامی برطانیہ نے سنبھال لی اور شام کی فرانس نے

تنک لباس : کم لباس۔ نیم عریاں۔ **اب وجد :** باپ دادا۔

۱۔ سوال یہ ہے کہ کس مقام کو تہذیب کے فرشتے کی ضرورت ہے ؟ موجودہ زمانے میں اس کا بندوبست کر لینا کچھ مشکل نہیں۔

۲۔ اس کی ضرورت وہاں ہے جہاں جوا نہیں کھیلا جاتا۔ جہاں عورتیں نیم عریاں نہیں رہتیں۔ جہاں شراب پینا حرام بتایا جاتا ہے۔

۳۔ تہذیب کی ضرورت وہاں ہے جہاں جسم میں ایک بے صبر روح موجود ہو اور اس کی تھاہ کسی کو نہ مل سکے۔ جہاں باپ دادا کے طور طریقوں سے بیزاری نہ پیدا ہوئی ہو۔

۴۔ عربی بدوؤں کے بچے بہادر بھی ہیں ، دانا بھی اور قوی و توانا بھی۔ پھر وہاں درس گاہیں بھی موجود نہیں ، جن

کے فیض کا چشمہ جاری رہتا ہے۔

۵۔ جن مقامات میں یہ باتیں پائی جائیں، ان کے متعلق یورپ والوں کا فتویٰ یہی ہے کہ وہ تمدن اور تہذیب سے خالی ہیں۔

اس نظم کی ایک خاص طور پر قابلِ توجہ خوبی یہ ہے کہ یورپی داناؤں کے نقطۂ نگاہ سے جہاں یہ بتایا کہ کون کون سے مقامات تہذیب سے خالی ہیں، وہاں ضمناً یہ بھی بتا دیا کہ یورپی تہذیب اپنے ساتھ کیا کیا چیزیں لاتی ہے۔ مثلاً جوا، عورتوں کو نیم عریاں لباس پہنانا، شراب نوشی، باپ دادا کے طور طریقوں سے بیزاری، بزدلی، نادانی، کمزوری وغیرہ۔

لادین سیاست

خبیر: خبر رکھنے والا۔ **بصیر**: دیکھنے والا۔ **دوں نہاد**: کم اصل۔ **ہراول**: فوج کا سب سے اگلا دستہ۔

۱۔ جو بات حق ہو وہ مجھ سے چھپی نہیں رہتی۔ خدا نے مجھے ایسا دل عطا کیا ہے جو خبردار اور دیدہ ور ہے۔

۲۔ میں اس سیاست کو خوب جانتا ہوں، جو دین کی قید سے آزاد ہے۔ وہ شیطان کی لونڈی ہے، کم اصل ہے اور اس کا ضمیر مر چکا ہے۔

۳۔ مسیحی مذہب کو چھوڑ دینے کے باعث حکومت ہر اخلاقی پابندی سے آزاد ہو گئی۔ اب اہل یورپ کی سیاست ایک دیو کی حیثیت رکھتی ہے، جس کی زنجیریں کھول دی گئی ہوں۔

۴۔ جب یہ سیاست کسی غیر ملک پر قبضہ جمانا چاہتی ہے تو گرجے کے سفیر یعنی پادری سب سے پہلے وہاں پہنچ جاتے ہیں

مراد یہ ہے کہ پہلے پادری تبلیغ کے لیے وہاں ڈیرے لگا لیتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ یورپی قومیں قدم جماتی ہیں۔

دامِ تہذیب

۱۔ اقبال کو اہلِ یورپ کی اس خصوصیت میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہر مظلوم ملّت کے ہمدرد بن جاتے ہیں۔
۲۔ مسیحیت کے مذہبی پیشواؤں کی یہ کرامت ہے کہ اس نے بجلی کے چراغ جلا کر خیالات میں روشنی کر دی۔
۳۔ مگر میرا دل شام اور فلسطین کی حالتِ زار پر کُڑھ رہا ہے۔ عجیب گتھی پیش آ گئی ہے جو تدبیر سے کُھل نہیں سکتی۔
۴۔ ان ملکوں کے غریب باشندے ترکوں کے پنجے سے تو آزاد ہو گئے، جنھیں اہلِ یورپ ظالم کہا کرتے تھے،
لیکن اب وہ یورپی تہذیب کے پھندے میں گرفتار ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جب شام، فلسطین اور دوسرے عرب ممالک ترکی سلطنت میں شامل تھے تو اہل یورپ بار بار کہہ رہے تھے کہ ترک ان پر ظلم کر رہے ہیں۔ آخر پہلی جنگ یورپ میں یہ ملک آزاد ہو گئے، لیکن شام پر فرانس نے اور فلسطین پر برطانیہ نے قبضہ جما لیا اور وہ ظلم وستم شروع کیے کہ الامان والحفیظ۔ ہزاروں عرب موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ ایسا کوئی نظارہ ترکی حکومت کے ماتحت چار سو سال میں نہ دیکھا گیا تھا۔ اقبال طنز کے طور پر کہتے ہیں کہ یورپ اپنے آپ کو ہمیشہ مظلوموں کے طرف دار کہتے رہے اور ترکوں کو ظالم بتاتے رہے، لیکن اب شام و فلسطین میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا ذمہ دار کون ہے؟ مان لیجیے کہ ترک ظالم تھے۔ ان سے تو آزادی حاصل ہو گئی ہے۔ اب شامیوں اور فلسطینیوں پر جو ظلم ہو رہے ہیں، کیا یہ یورپی تہذیب کے کرشمے نہیں؟

نصیحت

لرد: لارڈ کی ایرانی شکل

۱۔ ایک فرنگی لارڈ نے اپنے بیٹے سے کہا۔ کوئی ایسا نظارہ مانگ جسے دیکھتے دیکھتے تیری آنکھ کبھی سیر نہ ہو۔
یعنی معمولی نظاروں کی آرزو نہ کر بلکہ بہت بڑے نظارے کو اپنا نصب العین بنا۔

۲۔ اگر بھیڑ یے کے بچے پر شیر کے طور طریقے ظاہر کردیں تو اس غریب کے حق میں اس سے بڑا ظلم اور کوئی نہیں ہو سکتا

مراد یہ ہے کہ حکمرانوں کو اپنی حکومت کے بھید محکوموں کے سامنے کبھی ظاہر نہ کرنے چاہئیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ وہ ان رازوں کو سمجھ نہ سکے گا۔ سمجھ بھی لے تو ان پر عمل نہ کر سکے گا۔ اس لیے کہ اس کا مقام و مرتبہ حکمرانی کا نہیں محکومی کا ہے۔ اگر بہ فرضِ محال وہ ان طور طریقوں کو اپنا لے تو پھر محکوم نہ رہے گا اور ہماری حکمرانی ختم ہو جائے گی۔

۳۔ بہتر یہی ہے کہ حکمرانی کا راز اپنے سینے میں محفوظ رکھا جائے۔ یہ معلوم رہنا چاہیے کہ محکوم تلوار وں کے ذریعے سے زیر نہیں کیے جاتے۔ انھیں حقیقی معنی میں زیر کرنے کے طریقے اور ہیں۔

۴۔ وہ طور طریقے کیا ہیں؟ مثال کے طور پر تعلیم کا نظام ایسا بنانا چاہیے جو محکومی کی خودی کے لیے تیزاب کا کام دے۔ اس طرح خودی موم کی مانند ملائم ہو جائے گی۔ پھر اس سے جو کام چاہو، لے لو اور جس شکل پر چاہو ڈھال لو۔

۵۔ تعلیم کے تیزاب کی خصوصیتوں پر غور کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ تاثیر میں اکسیر سے بڑھا ہوا ہے۔ یہ تیزاب سونے کے ہمالیہ جیسے پہاڑ کو بھی مٹی کا ڈھیر بنا سکتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ برطانیہ نے ہندوستان میں جو نظام تعلیم جاری کیا، اس نے ہماری قوم کے اخلاق اور مخصوص انفرادی تصورات پر بہت برا اثر ڈالا۔ لوگ اپنے قومی اوصاف کو چھوڑ کر فرنگیوں کے نقّال بن گئے۔ وہی تہذیب، فکر و نظر کا وہی انداز، وہی طریق بود و ماند اور وہی نشست و برخاست۔ ایسے حالات میں کوئی قوم اپنی انفرادی حیثیت برقرار نہیں رکھ سکتی اور فرنگیوں کی پیدا کی ہوئی ان مصیبتوں سے ہماری قوم کو اب تک نجات نہیں مل سکی۔

ایک بحری قزّاق اور سکندر

۱۔ سکندر بحری لٹیرے سے کہتا ہے کہ تیری لوٹ مار اور غارت گری سے سمندر کی وسعت میں آہ و فریاد کا شور مچا ہوا ہے۔ اب تو میرے قابو میں آگیا ہے۔ بتا تو زنجیریں پہن کر قیدی بنا رہنا منظور کرتا ہے یا میں اپنی تلوار سے تیری گردن اڑا دوں؟

۲۔ لٹیرا جواب دیتا ہے: سکندر! جوانمردوں کا یہ کام نہیں کہ ہم پیشہ آدمیوں کی ذلّت گوارا کریں افسوس کہ تو مجھے ذلیل کرنا جوانمردی سمجھتا ہے۔

۳۔ تیرا پیشہ بھی ظلم، خونریزی اور لوٹ مار ہے۔ ہم دونوں لٹیرے ہیں۔ تو میدانی لٹیرا ہے اور میں سمندری اور کوئی فرق نہیں۔

جمعیتِ اقوام

پہلی جنگ یورپ کے بعد فاتح قوموں نے جو جمعیت اقوام بنائی تھی، وہ آخر کار برطانیہ اور فرانس کے مقاصد کا آلہ کار بن گئی۔ اس کی کمزوری تو پہلے ہی ظاہر ہو رہی تھی، لیکن ۱۹۳۵ء میں اٹلی نے ابی سینیا پر حملہ کیا تو جمعیت کے لیے دو ٹوک فیصلے کا نازک وقت آگیا۔ اگر وہ اٹلی کے حملے کی مذمت نہ کرتی تو اپنی حیثیت کھو بیٹھتی۔ اگر مذمت کرتی تو جرمنی، اٹلی اور بعض دوسری قومیں اس بارے میں ساتھ دینے کے لیے تیار نہ تھیں اور برطانیہ و فرانس اس معاملہ پر جنگ نہ چھیڑ سکتے تھے۔ اس زمانے میں ہر شخص کی زبان پر یہی بات تھی کہ جمعیت اقوام ختم ہو رہی ہے۔ اسی مضمون کو اقبال نے ذیل کے اشعار میں پیش کیا ہے۔

مبرم : اٹلی

۱۔ غریب جمعیتِ اقوام پر کئی دن سے نزع کی حالت طاری ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ اس کے مرجانے کی منحوس خبر میرے منہ سے نہ نکل جائے۔

۲۔ بظاہر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب موت ٹل نہیں سکتی، لیکن مسیحیت کے بڑے بڑے سیاست دان اس کے لیے دعاؤں میں لگے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے، ان دعاؤں سے ٹل جائے۔

۳۔ ہو سکتا ہے، بوڑھے فرنگی کی یہ داشتہ ابلیس کا تعویذ لے کر کچھ دن تک اور سنبھل جائے اور زندہ رہے

شام و فلسطین

حلب: شام کا ایک مشہور شہر جو کسی زمانے میں شیشے بنانے کے لیے مشہور تھا اور وہیں اعلیٰ درجے کے آئینے بنائے جاتے تھے۔ شیشۂ حلبی اور آئینۂ حلبی دونوں فارسی اور اُردو ادبیات میں معروف ہیں۔ **نارنج:** نارنگی، سنگترہ مالٹا۔ فلسطین کے ساحلی علاقے میں سنگترے اور مالٹے کے بہت وسیع باغ ہیں۔ یہودیوں نے زمینیں خرید خرید کر دور تک باغ لگا دیے۔ **رطب:** چھوارا، کھجور۔

۱۔ فرانس کے رندوں کا شراب خانہ سلامت رہے۔ وہ جب سے شام پر مسلط ہوئے ہیں، انھوں نے ہر جگہ شراب نوشی عام کر دی ہے۔ گویا حلب کے ہر شیشے کو گلاب کے پھول جیسی سرخ شراب سے بھر دیا ہے۔

۲۔ شام فرانس نے سنبھال لیا تھا، فلسطین پر انگریز قابض ہو گئے اور انھوں نے اسے یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی ٹھان لی۔ ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ اس پردے میں یہودیوں کی بڑی تعداد فلسطین پہنچا دیں اور انھیں اپنی سرپرستی میں اس قدر مضبوط کر دیں کہ وہ عربوں کے پہلو میں خنجر بنے رہیں۔ قومی وطن کے دعوے کی بنا یہ تھی کہ یہودی اصل میں فلسطین ہی کے باشندے تھے۔ اقبال کہتے ہیں کہ اگر یہودیوں کو دو ہزار سال کے بعد فلسطین کا حق دار بنا دینا جائز ہے تو یہ بتائیے کہ ہسپانیہ پر عربوں کا حق کیوں نہیں جو آٹھ سو سال وہاں حکمران رہے اور انھیں وہاں سے نکلے ہوئے ابھی صرف پانچ سو سال ہوئے ہیں؟ اس اعتراض کا جواب کوئی نہیں ہو سکتا۔

یہودی سب سے پہلے نبوکدنزر (بخت نصر) کے وقت میں فلسطین سے نکلے۔ وہ یہودیوں کی بڑی تعداد کو قید کر کے بابل لے آیا تھا۔ یہ حضرت مسیحؑ سے چھ سو سال پیشتر کا واقعہ ہے۔ پھر رومیوں نے فلسطین پر حملہ کیا تو یہودیوں کو وہاں سے نکالا۔ سب سے آخر میں عیسائیوں نے انھیں جلاوطن کیا۔ جب مسلمانوں نے اسے فتح کیا تو اس کی حکومت عیسائیوں کے قبضے میں تھی۔ مسلمانوں نے کسی یہودی کو نہ نکالا، بلکہ انھیں دوبارہ لا کر آباد کیا۔ تاہم اس ناشکرگزار قوم نے موقع پا کر انگریزوں سے ساز باز کر لی اور ان کے مقاصد کا آلۂ کار بن کر فلسطین پہنچے۔ اس وجہ سے عربوں پر جو مصیبتیں نازل ہوئیں، ان کا سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہوا۔ مسلمان پہلی صدی ہجری میں ہسپانیہ پہنچ گئے تھے یعنی ساتویں صدی مسیحی اور انھیں عیسائیوں نے ۱۴۹۲ء میں جلاوطن کیا۔ مسلمان آٹھ سو سال تک اہلِ ہسپانیہ کے تمدن، مذہب اور قدیم علمی آثار کی حفاظت کرتے رہے۔ عیسائیوں کو مسلمانوں پر غلبہ حاصل ہوا تو ہر اسلامی چیز مٹا کر رکھ دی، یہاں تک کہ قیمتی کتب خانے بھی نذرِ آتش کر دیے۔ یقیناً ہسپانیہ پر عربوں کا حق اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا کہ یہودیوں کا فلسطین پر ہے۔

۴۔ اقبال کہتے ہیں کہ فلسطین میں یہودیوں کا لانا اس لیے نہیں کہ فلسطین ان کا قومی وطن ہے۔ یہ سمجھ نہیں کہ انگریز اس ذریعے سے سنگترے، مالٹے، شہد اور کھجور کی تجارت کرنا چاہتے ہیں۔ انگریزوں کے سامراج کا اصل مقصد اور ہی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ عربوں میں تفرقہ ڈال سکیں۔ انھیں اپنے آپ کو منظم کرنے کا موقع نہ دیں اور ہر وقت ان کے لیے بے چینی کا باعث بنے رہیں۔ نیز اگر جنگ کا نازک موقع پیش آ جائے تو فلسطین کو مرکز بنا کر اردگرد کی اسلامی آبادیوں اور بڑے بڑے جنگی مقامات پر حملے کر سکیں، مثلاً نہر سویز، باب المندب، پورٹ سوڈان وغیرہ۔

سیاسی پیشوا

عنکبوت: مکڑی

۱۔ یہ آج کل جن لوگوں نے سیاست کی پیشوائی سنبھال رکھی ہے۔ ان سے کیا امید کی جا سکتی ہے؟ یہ لوگ تو مٹی سے کھیلنے والے ہیں اور مٹی ہی سے ان کا تعلق ہے۔ گویا ان کے خیالات بھی پست ہیں اور یہ پستی ہی کو پسند کرتے ہیں

۲۔ ان کی نگاہیں ہمیشہ چیونٹیوں اور مکھیوں پر رہتی ہیں اور دنیا میں ان کی کمند مکڑی کے جالے کی سی ہے۔

مکڑی کے جالے کی ایک صفت قرآن مجید میں آئی ہے:

مثل الذین اتخذوا من دون اللہ اولیاء کمثل العنکبوت۔ اتخذت بیتا وان اوھن البیوت لبیت العنکبوت لو کانوا یعلمون۔

جن لوگوں نے اللہ کے سوا حامیتی بنا لیے ہیں۔ ان کی مثال مکڑی کی سی ہے۔ اس نے گھر بنایا اور تحقیق تمام گھروں سے زیادہ بودا گھر مکڑی کا ہے۔ کاش وہ جانتے۔

مطلب یہ ہے کہ سیاست دانوں کی کمند اتنی کمزور ہوتی ہے کہ اسے مکڑی کے جالے کی طرح بودا سمجھنا چاہیے۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس جالے میں مکھی اور چیونٹی جیسی بے حقیقت چیزوں کے سوا کسی کو پھانسا نہیں جا سکتا۔

۳۔ خوش نصیب ہے وہ قافلہ جس کے سالار کا سرمایہ فرشتوں جیسے خیالات اور بلند جذبے ہوں۔ یعنی حقیقی سیاسی پیشوا وہی ہے جس کے خیالات نہایت پاکیزہ ہوں اور جذبے نہایت بلند۔

نفسیاتِ غلامی

شیوخ: شیخ کی جمع

۱۔ قوموں کی بیماریوں کے اسباب بہت گہرے ہوتے ہیں اور بال کی طرح باریک۔ اگر انہیں کھول کر بیان کرنا چاہیں تو قوت بیان ساتھ نہیں دیتی۔ یعنی بیان نہیں ہو سکتے۔

۲۔ غلاموں کے امام اور سردار اس درجہ گر جاتے ہیں کہ شیروں کا دین بھی ان کے سامنے پیش ہو تو اسے بھی لومڑی پن کے فلسفے کا لباس پہنانے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ بالکل درست ہے۔ ان کی نگاہیں بھی پست ہوتی ہیں اور خیالات بھی پست۔ پھر غلامی کے باعث ان میں ہمت و جرأت باقی نہیں رہتی، لہٰذا وہ اعلیٰ اصول کو بھی عیاری اور مکاری کے نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

۴۔ حق یہ ہے کہ اگر سچائی کی طرف بلانے والا کوئی کلیم اللہ، کوئی سرمایہ دارِ وقت کے فرعون یعنی جابر بادشاہ سے خفیہ خفیہ ساز باز کرلے اور اسی کے ارادوں کو پورا کرنے میں لگا رہے تو سرمایہ دار اور اس کی سرداری قوم کے حق میں لعنت بن جائیں گے۔

حضرت موسیٰ اس لیے کامیاب ہوئے کہ وہ خفیہ اور علانیہ فرعون کی قوت توڑنے کے لیے جہاد میں لگے رہے۔ اب اگر کوئی حضرت موسیٰ کے مقام پر فائز ہونے کا دعویٰ دار ہو اور وقت کے فرعون کا خفیہ خفیہ مددگار بن جائے تو ظاہر ہے کہ کسی بھی قومی مقصد کو پورا نہ کرسکے گا اور قوم ناکامی کی ٹھوکریں کھاتی رہے گی۔

غلاموں کی نماز

یہ نظم اس وقت لکھی گئی تھی، جب ترکی سے ہلالِ احمر کا ایک وفد لاہور آیا تھا۔ ارکانِ وفد نے شاہی مسجد میں نماز جمعہ ادا کی۔ غالباً امام نے سجدے بہت طویل کیے۔ رئیس وفد نے نماز کے بعد اس کے متعلق اقبال سے پوچھا تو معلوم نہیں انھوں نے کیا جواب دیا، لیکن بعد میں اپنے خیالات اس نظم میں پیش کردیے۔

نماز کا حقیقی مقصد یہ ہے کہ انسان کا تعلق خدا سے قائم رہے۔ دن میں پانچ وقت بندہ اپنے خالق کی بارگاہ میں حاضر ہوتا ہے۔ سجدے غیر معمولی طور پر لمبے کیے جائیں تو ظاہر ہے کہ وقت زیادہ لگے گا۔ ترک چونکہ اتنے لمبے سجدوں کے عادی نہ تھے اس لیے انھیں حیرت ہوئی اور اقبال سے سبب پوچھا۔

مرد راہ گزرنا

۱۔ نماز سے فارغ ہو کر ترکی مجاہد نے مجھ سے سوال کیا کہ تمھارے امام اتنے لمبے سجدے کیوں کرتے ہیں؟

۲۔ وہ سیدھا سادہ مجاہد آدمی اور آزاد مومن، اسے کیا معلوم تھا کہ غلام کی نماز کیا چیز ہوتی ہے؟

۳۔ آزاد مردوں کو دنیا میں ہزاروں کام ہیں۔ انھیں کے عمل کی لذت سے قوموں کے انتظامی سلسلے قائم رہتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ آزاد مومن اور مجاہد ہر وقت قوم کے بچاؤ یا ترقی کے کاموں میں لگے رہتے ہیں۔ اسی جدوجہد کی

برکت سے قوم امن و اطمینان کی زندگی گزارتی ہے۔

۴۔ اس کے برعکس غلام کے جسم میں عمل کی تڑپ ہوتی ہی نہیں اور اس کا دن رات یکساں رہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان پر گزرنا حرام کر دیا گیا ہے۔

۵۔ اگر ان کے سجدے لمبے ہیں تو اس پر حیران ہونے کی کون سی بات ہے؟ ان غریبوں کو سجدہ کر لینے کے سوا اور کام ہی کیا ہے؟

۶۔ میری دعا ہے کہ خدا ہندوستان کے اماموں کو وہ سجدہ نصیب کرے، جس میں قوم کے لیے زندگی کا پیغام موجود ہو۔

فلسطینی عرب سے

یہودی انگریزوں کی سرپرستی میں فلسطین آنے لگے تو عربوں کے لیے ایک خوفناک مصیبت پیدا ہو گئی۔ کئی مرتبہ کشاکش کی نوبت آئی۔ عربوں نے جمعیت اقوام اور حکومت برطانیہ دونوں سے درخواستیں کیں کہ اس مصیبت کو ختم کیا جائے، لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ اقبال نے انھیں یہ پیغام دیا کہ خودی کی پرورش کرو اور اس سے کام لو۔ اسی میں تمھاری نجات ہے

۱۔ اے فلسطینی عرب! میں جانتا ہوں کہ تیرے وجود میں وہ آگ بھری ہوئی ہے جس کی جلن اور حرارت کی طرف سے دنیا کو اب تک اطمینان نہیں ہوا، یعنی تیرے مجاہدانہ کارنامے زمانے بھر پر آشکارا ہیں اور قومیں اب تک ڈری سہمی بیٹھی ہیں کہ تو نے کروٹ لی تو پھر پرانا دور شروع ہو جائے گا اور تیری پیش قدمی کا سیل کسی کے روکے نہ رک سکے گا۔

۲۔ میں تجھے صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ تیرے دکھ کی دوا نہ جنیوا میں مل سکتی ہے، جو جمعیت اقوام کا مرکز ہے اور نہ لندن میں جو سلطنت برطانیہ کا دار الحکومت ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ یورپ کی شاہ رگ یہودیوں کے قبضے میں ہے۔ وہی ہیں جن کے مال و زر کی بدولت یورپ کی حکومتیں اور تجارت و صنعت کے کارخانے چل رہے ہیں۔ کوئی بھی یورپی حکومت ان کے اثر سے آزاد نہیں، لہٰذا فلسطینی عربوں کی آزادی کا سوال اٹھا کر یہودیوں کو ناراض کرنے کی کون

جرات کرسکتا ہے؟

۳۔ پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر نجات کا راستہ کیا ہے؟ اس مصیبت سے چھٹکارا کیوں کر حاصل کیا جائے؟
اقبال کہتے ہیں کہ غلامی سے قومیں نجات حاصل کرنا چاہیں توان کا فرض ہے کہ خودی کی تربیت کریں پھر اسے معرض عمل میں لائیں اور اس سے کام لیں۔

مشرق و مغرب

رنجوری: بیماری

۱۔ ایشیا میں بیماری کا سبب محکومی اور تقلید ہے۔ محکومی سے مراد ہے سیاسی غلامی اور تقلید سے مراد ہے ذہنی غلامی۔ ایشیا کی قومیں ان دو بیماریوں کے سبب پستی میں گرگئیں۔ یورپ میں بیماری کا سبب جمہوری نظامِ حکومت ہے جس کی وجہ سے ان کے اخلاق پست ہو گئے۔

۲۔ غرض دل اور نظر کی بیماری دنیا میں عام ہو گئی ہے۔ نہ ایشیا اس سے محفوظ ہے نہ یورپ۔

نفسیاتِ حاکمی

اس نظم میں اقبال نے ان اصلاحات پر جامع تبصرہ کردیا ہے جو انگریز اپنے عہد حکومت میں ہندوستانیوں کو دیتے رہے۔ ان میں سے قابل ذکر اصلاحات تین تھیں۔ اوّل منٹو مارلے اصلاحات۔ دوم: دوعملی کا نظام۔ سوم: وہ نظام جسے صوبائی خودمختاری کا نظام کہتے تھے۔

ان اصلاحات کا مقصد یہ تھا کہ محکوموں میں بے چینی کی جو لہر دوڑ گئی ہے اسے دبادیا جائے۔ چنانچہ یہی ہوتا رہا۔

جب نئی اصلاحات آئیں، ایک گروہ انھیں مناسب سمجھ کر قبول کر لیتا اور انگریزوں کو دس بارہ سال اور اطمینان سے گزارنے کا موقع مل جاتا۔ ان کی وجہ سے ہندوستانیوں میں تفرقے اور پھوٹ کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ باقی ان کے متعلق جو کچھ اقبال نے کہا ہے وہ اشعار کی شرح کے سلسلے میں پیش ہو گا۔

۱۔ یہ اصلاحات جنھیں شکاری کی محبت کا نشان بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اصل میں اس کی بیدردی کے پیچھے پڑے کا کام دے رہی ہیں۔ میں نے جو سننے نغمے گائے، وہ میرے کسی کام نہ آ سکے۔

مراد یہ ہے کہ آزادی کے طلب گاروں نے جو نعرے لگائے جو جدوجہد کی۔ قید و بند کی صورت میں جو قربانیاں انھوں نے دیں وہ کوئی فائدہ نہ پہنچا سکیں۔ اصلاحات کو ایسے انداز میں پیش کیا گیا۔ گویا حکومت کو ہم سے خاص محبت ہے، وہ ہماری دلی خیرخواہ ہے اور ہمیں آزادی کی منزل پر پہنچانا چاہتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اصلاحات اس نے اپنی حکمرانی کو مضبوط و مستحکم رکھنے کی غرض سے تیار کیں تاکہ ایک گروہ کو ان کے جال میں الجھا کر آزادی کے علم داروں کی تحریک کو ناکام بنا دے اور یہی ہوتا رہا، لہٰذا یہ اصلاحات حکومت کی بیدردی کو چھپانے کا ایک ذریعہ بن گئیں۔

۲۔ ان کی حیثیت کیا ہے؟ یہ نہیں کہ شکاری نے قید کیے ہوئے پرندوں کو آزاد کر دیا اور پنجرے کی کھڑکیاں کھول دیں بلکہ اس نے مرجھائے ہوئے پھول چُن چُن کر پنجرے میں رکھنے شروع کر دیے، اس امید پر کہ شاید قیدی پرندے قید میں پڑے رہنے پر راضی ہو جائیں۔

مراد یہ ہے کہ اصلاحات کی حیثیت ان مرجھائے ہوئے پھولوں کی سی ہے جو اس غرض سے پنجرے میں رکھے جائیں کہ قیدی پرندے انھیں دیکھ کر خوش ہو جائیں۔ گویا نہ آزادی ملی نہ اس کے ملنے کی کوئی صورت پیدا ہوئی۔ نہ جو کچھ دیا گیا وہ اس قابل ہے کہ کسی کو مطمئن کر سکے۔

محراب گُل افغان کے افکار

واضح رہے کہ محراب گُل ایک فرضی نام ہے

۱

چرغ: ایک شکاری پرندہ۔

۱۔ اے میرے پہاڑی وطن! میں تجھے چھوڑ کر کہاں چلا جاؤں؟ تیری چٹانوں میں تو میرے بزرگوں کی قبریں ہیں۔

۲۔ جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے اسی وقت سے تجھ میں شاہین اور چرغ جیسے شکاری پرندے رہتے ہیں تو لالہ اور گلاب کے پھولوں سے خالی اور بلبل کے نغموں سے پاک ہے۔

مراد یہ ہے کہ تیرے باشندوں کی زندگی ہی جنگ و جہاد ہے اور عیش و نشاط کے سامانوں سے کوئی علاقہ نہیں۔

۳۔ تیرے پیچ و خم میں میرے لیے بہشت چھپی ہوئی ہے۔ تیری مٹی سے مشک و عنبر کی خوشبو آتی ہے اور تیرا پانی چمکیلا ہے

۴۔ باز کبھی چکورا اور کبوتر کا غلام نہیں ہو سکتا۔ کیا میں جسم کے بچاؤ کی خاطر روح کا خاتمہ کر ڈالوں؟

مطلب یہ کہ میں انگریز کی غلامی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ غلامی سے انسان کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔ گویا انسان پر روحانی موت طاری ہو جاتی ہے۔ میں اپنا ضمیر کسی بھی قیمت پر بیچ نہیں سکتا۔

۵۔ اے میرے غیرت مند فقر! تو نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ انگریز کا عطا کیا ہوا خلعت پہنے گا یا پھٹے پرانے کپڑے؟

یعنی میں اپنے تار تار لباس کو انگریز کے اس خلعت سے کہیں بہتر سمجھتا ہوں جو اس کی غلامی کے صلے میں حاصل ہو

خلعت میں اشارہ ہے ان انعامات اور جاگیروں کی طرف جو انگریز اپنے مقاصد کے لیے بعض سرحدی سرداروں کو دیتے رہتے تھے اور اس وجہ سے قوموں میں پھوٹ ڈالنے کا سامان کر رکھا تھا۔

۲

لَا شَرِیْکَ لَہٗ: اللہ تعالیٰ کا شریک کوئی نہیں۔

اسے مخاطب! جب سے یہ جہان پیدا ہوا ہے، یہ حقیقت لگاتار ہمارے سامنے رہی ہے کہ دنیا کی مختلف قوموں کے اندر لڑائی جھگڑے کی صفیں آراستہ ہیں۔ایک قوم سے دوسری قوم بازی لے جانے میں سرگرمِ عمل ہے۔ بوڑھے آسمان کی نظروں میں نہ میں محبوب ہوں، نہ تُو۔ یعنی یہ امر ہرگز ہمارے ذہن نشین نہ ہونا چاہیے کہ ہم پر زمانے کی نگاہِ کرم ہے۔ ہمیں دنیا کی کوئی قوم نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ کامیابی اسی کے لیے ہے جو اس کشمکش میں ہمت، جرأت، جوانمردی اور استقلال کا زیادہ سے زیادہ ثبوت دے سکے۔

۲۔ تو اپنی خودی میں ڈوب جا اور زمانے کے مخالف حالت سے نا امید نہ ہو۔کیونکہ زمانہ تیرے دل کو جو زخمی کر رہا ہے، وہ دراصل ٹانکے لگا کر اسے سینے کے انتظام میں مصروف ہے۔

مُراد یہ ہے کہ تُو اپنی قوت اور مقام پہچان کر خودی کو درجۂ کمال پر پہنچا لے۔ اس دوران میں جو تکلیفیں اور مصیبتیں پیش آئیں، ان سے گھبرانا نہ چاہیے۔ پھر خود وہ مصیبتیں ہی تیرے لیے آرام و راحت کے سامان مہیا کر دیں گی۔

۳۔ اگر یہ حقیقت کہ خدا کا شریک کوئی نہیں، تیرے دل کی گہرائیوں میں اتر جائے تو دنیا بھر میں کسی بھی اعتبار سے کوئی قوم تیرا مقابلہ نہ کر سکے گی اور تو تمام اقوامِ عالم سے بالا نشین ہو جائے گا یعنی اے ملتِ اسلامیہ! اگر یہ صداقت تیرے جسم کی رگ رگ میں سما جائے کہ ذات کے علاوہ تمام صفتوں اور عظمتوں کے اعتبار سے بھی کائنات کی کوئی ہستی اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں نہیں ٹھہر سکتی اور تو باری تعالیٰ کے احکام پر بخوبی کاربند ہو جائے تو دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کے سر تیرے بے پناہ اوج و عروج کے آگے خم ہو جائیں گے۔

۳

۱۔ اگر تو بارگاہِ الٰہی میں دعا مانگے تو اس سے تیری تقدیر میں بے شک تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی، لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ تیرے قلب و نظر میں انقلاب آ جائے۔یعنی تو یہ حقیقت ذہن میں بٹھا کر کہ خدا کی رضا اور اس کے حصول کا طریقہ کیا ہے، دُعا بھی کرتا جائے۔ ساتھ ساتھ احکام الٰہی کی تعمیل میں سرگرم جد و جہد بھی جاری رکھے۔ دعا کا فلسفہ ہی یہ ہے کہ انسان خدا سے جو کچھ مانگتا ہے، اسے حاصل کرنے کے لیے عزم و ہمت کا پیکر بن جائے اس لیے کہ جو کچھ وہ مانگے گا، اسی کو اپنا نصب العین بنائے گا۔لازم ہے کہ اس کے لیے سامان

لازم ہے کہ اس کے لیے سامان بھی جمع کرے۔ جو دعا ان اثرات سے خالی ہو، وہ حقیقی معنی میں دعا ہی نہیں۔

۲۔ اے مسلمان! اگر تو عشق حق میں ڈوب کر خودی کے بلند ترین مقام پر پہنچ جائے تو یقیناً ملّتِ اسلامیہ کی ساری زندگی میں حیرت انگیز و خوش آیند تغیر واقع ہو جائے۔ وہ ذلت و پستی کی گہرائیوں سے نکل کر عزّت و عظمت کی بلندیوں پر پہنچ جائے۔

۳۔ اگر تیری خودی میں انقلاب پیدا ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ اگرچہ محفل میں شراب بھی وہی رہے گی۔ اور مستوں کی ہاؤ ہو میں بھی فرق نہ آئے گا، لیکن ساقی کا رنگ ڈھنگ اور شراب پینے کا طور طریقہ بدل جائے گا۔

مُراد یہ ہے کہ دنیا میں فطرت کے آئین و قوانین تو وہی رہیں گے، لیکن خُدا تجھ سے راضی ہو جائے گا، وہ رحم و کرم سے تجھے نوازے گا اور ساقی بھی تجھ پر نگاہِ لطف ڈالے گا۔

۴۔ تو عام طور پر درگاہِ باری تعالیٰ میں یوں دعا کرتا ہے: اے خدا! مجھ پر ایسی رحمت کی نظر ڈال کہ میں دنیا کی نگاہوں میں عزّت و عظمت کا نہایت بلند مقام حاصل کرلوں، لیکن میری دعا یہ ہے کہ تیری یہ آرزو ہی بدل جائے اور اللہ تعالیٰ تجھے کتاب و سنت پر عمل کرنے کی توفیق دے، جس سے تو مردِ مومن بن کر دین و ملت کی خدمت کے لیے زندگی وقف کر دے۔

۱۴

الحکم للہ، الملک للہ: حکومت بھی اللہ کی ہے اور ملک بھی اُسی کا ہے۔

۱۔ ٹیڑھا چلنے والا آسمان، سورج اور چاند سب کے سب مسافر ہیں اور راستے کی تھکان کے باوجود کہیں رکتے نہیں، برابر سفر کیے جا رہے ہیں۔ یعنی کائنات کی کسی بھی چیز کو قرار، قیام اور پائیداری حاصل نہیں۔ یہ دنیا چل چلاؤ کا مقام ہے۔

۲۔ سکندر بجلی کی طرح کڑکا تھا، لیکن اسے اچانک موت! تو جانتی ہے کہ اُس کا انجام کیا ہوا؟ یعنی دنیا کا بہت بڑا بادشاہ سکندر یونان سے چل کر ملک پر ملک فتح کرتا ہوا پنجاب تک آ پہنچا، لیکن موت نے تھوڑے سے ہی دنوں میں اس کا خاتمہ کر دیا۔

۳۔ نادر شاہ نے دلّی کا خزانہ لُوٹ لیا، لیکن ایک تلوار کے وار نے اس کا قصّہ مختصر کر دیا۔ یعنی ایران کا بادشاہ جس کی فتوحات کی دھوم ساری دنیا میں مچی ہوئی تھی، طہران سے چل کر فاتحانہ ترک تاز کرتا ہوا دلی پہنچا، لیکن فتح دہلی سے آٹھ سال بعد وہ اپنے ہی امیروں کی ایک سازش کے باعث مارا گیا۔ تلوار کی ایک ضرب نے اس

کا کام تمام کر ڈالا۔

۴۔ سکندر، نادر اور ان جیسے بہت سے دوسرے بڑے بڑے بادشاہ اپنی اپنی عظیم الشان سلطنتوں کے دور میں فتح و ظفر کے پھریرے اڑاتے ہوئے ہمیشہ کے لیے نظروں سے غائب ہو گئے اور آج ان میں سے کسی کا بھی وجود باقی نہیں، لیکن افغان باقی ہے اور اس کا وطن کوہستان بھی بدستور باقی ہے۔ سچ ہے، دائمی حکم خدا کا ہے، دائمی ملک اللہ کا۔

۵۔ حاجت ایک ایسی چیز ہے، جو آزاد لوگوں کو بھی غلام بننے پر مجبور کر دیتی ہے۔ حاجت شیروں کو بھی لومڑی بنا دیتی ہے۔ یعنی جب انسان کو ذاتی اغراض اور خواہشات پوری کرنے کی حاجت اور ضرورت پیش آجاتی ہے تو وہ دوسرے انسانوں کی اطاعت قبول کرتا ہے۔

۶۔ جب درویشی پر خودی کا رنگ چڑھ جاتا ہے تو انسان میں بے نیازی کی شان پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ خود شہنشاہ بن جاتا ہے۔ اسے خدا کے سوا کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں رہتی۔

۷۔ وہ درویش جو کبھی سلطان کے دربار میں حاضری نہیں دیتا، قوموں کی تقدیر بن جاتا ہے یعنی وہ مردِ حق جس میں خودی نے بے نیازی کی شان پیدا کر دی ہو، قوموں کی بگڑی ہوئی قسمت بنا سکتا ہے۔

۵

نوامیس: ناموس کی جمع۔ مراد قانون۔ قاعدے۔

۱۔ یہ موجودہ زمانے کی درس گاہیں، یہ نظامِ تعلیم، یہ کھیل کے ہنگامے، یہ چل چلاؤ کا شور، بظاہر یہ سب چیزیں بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ سمجھا جاتا ہے کہ قوم ترقی کر رہی ہے۔ اس کے نونہال علم سیکھ رہے ہیں لیکن اس حد درجہ خوشی میں ہر وقت نیا غم پیدا ہوتا رہتا ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ یہ نظامِ تعلیم ہمارے لیے راس نہیں۔ یہ ہمیں اپنے اصل مقاصد سے دُور پھینک رہا ہے۔

۲۔ آزاد مردوں کے حق میں وہ علم علم نہیں، زہر ہے، جس کا حاصل صرف یہ ہو کہ جَو دو مٹھیاں ملتی جائیں یعنی پیٹ بھرنے کا سامان ہوتا جائے۔

۳۔ اسے بے سمجھ! ادب اور فلسفہ کوئی چیز نہیں۔ ان سے انسان کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔ ہنر سیکھنے کے لیے

بھاگ دوڑ ضروری ہے۔

۴۔ ہنرمند قدرت کے قوانین پر بھی غالب آجاتا ہے۔ اس کی شام بھی صبح کی طرح روشن ہوتی ہے۔

۵۔ وہ چاہے تو اپنے فن کی برکت سے ایسی صورت پیدا کردے کہ سورج کے بدن سے روشنی شبنم کی طرح ٹپکنے لگے۔

۶

عالمِ ایجاد: دنیا۔ تقلید: لغوی معنی پیروی۔ اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی فرد یا جماعت کی پیروی کسی شرعی یا عقلی دلیل کے بغیر کی جائے۔ تجدید: لغوی معنی نیا اور تازہ کرنا۔ اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی قوم یا جماعت میں زندگی کی نئی روح پھونکی جائے۔ مجدّدین اسی غرض سے پیدا ہوتے ہیں۔ تجدید تجدّد کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی نئے طور طریقے رائج کرنا۔ یہاں انھیں معنی میں مستعمل ہوا ہے۔

۱۔ جو شخص اس دنیا میں نئی چیزیں پیدا کرتا رہتا ہے، زمانہ اپنے ہر دور میں اسی کے گرد چکر لگاتا ہے۔ اس دنیا میں قدر و منزلت انھیں لوگوں کی ہوتی ہے جو موجد کہلاتے ہیں یعنی جنھوں نے نئے علوم، نئے ہنر، نئی چیزیں وغیرہ ایجاد کیں۔

۲۔ تو اپنے پیش روؤں کی اندھی پیروی میں اپنی خودی کو برباد نہ کر۔ یہ بڑا قیمتی موتی ہے اور اس کی حفاظت کرنی چاہیے۔

۳۔ اس قوم کو نئے طور طریقوں اور نئی زندگی کا پیغام مبارک ہو، جو صرف رات کی بزم کا تصوّر اپنے دماغ میں جمائے بیٹھی ہے۔ یعنی جس نے کبھی اپنے پرانے طور طریقوں سے ادھر اُدھر ہونا گوارا نہیں کیا۔ اب اسے تجدید کا پیغام ملا ہے تو یہ واقعی مبارک باد دینے کا موقع ہے۔

۴۔ مگر آج کل تجدید کا جو شور برپا ہوتا ہے۔ ایشیا میں اسے صرف اہلِ یورپ کی اندھی پیروی کا بہانہ بنا لیا جاتا ہے لہٰذا مجھے ڈر یہ ہے کہ کہیں یہ پیغامِ تجدید بھی یورپ ہی کے رسم و رواج کو پھیلانے کا ذریعہ بن کر نہ رہ جائے۔

اس کی مثالیں ایک سے زیادہ مل سکتی ہیں۔ مثلاً ہندوستان میں تقسیم سے پہلے ہر جگہ یہی ہوا کہ شور مچایا گیا۔ پرانے طور طریقے چھوڑو اور مقصود یہ تھا کہ فرنگیوں کے طور طریقے اختیار کر لو۔ گزشتہ دور کی اسلامی حکومت کا طریقہ بھی یہی رہا۔ ترکی میں مصطفےٰ کمال، افغانستان میں امان اللہ، ایران میں رضا شاہ پہلوی سب اپنے عہد کے ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے تجدید کا بیڑا اٹھایا تھا لیکن ان کی کوششیں محض یہ تھیں کہ ان کے ملکوں کے باشندے سوٹ پہن لیں، ٹائی لگا لیں

منڈوادیں۔ عورتیں بے نقاب پھریں۔ سینما ہر جگہ رائج ہو جائیں۔ مصطفیٰ کمال نے ترکی زبان کے لیے بھی لاطینی رسم الخط اختیار کر لیا۔ ظاہر ہے کہ یہ تجدید یورپ کی اندھی پیروی کا ایک بہانہ تھی۔ اقبال کی خواہش یہ تھی کہ اعلیٰ درجے کی سائنٹیفک ایجادوں میں تو تقلید مفید سمجھی جا سکتی ہے۔ سوٹ پہننے یا ڈاڑھی منڈانے یا عورتوں کو بے پردہ پھرانے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے اور قوم کیا ترقی کر سکتی ہے؟

---- ۷ ----

پہلا بند

اٹلی والے بدل گئے۔ شام والوں نے زندگی کی نئی کروٹ لی۔ اہل ہند کی حالت میں بھی تغیر آ گیا۔ اسے کوہستان کے فرزند! تو بھی اپنی خودی سے آگاہ ہو تو بھی اپنی خداداد صلاحیتوں سے کام لے۔ غافل افغان! اپنی خودی کو پہچان

دوسرا بند

موسم اچھا ہو، پانی کی ذرا کمی نہ ہو اور مٹی میں زرخیزی کا جوہر اعلیٰ پیمانے پر موجود ہو۔ ان خوشگوار حالات میں بھی اگر کسی کسان نے بیج نہ ڈالا اور اپنے کھیت کو پانی نہ دیا تو اسے کون کسان کہے گا؟ غافل افغان! تو اپنی خودی کو پہچان اور حالات کے موافق ہونے سے فائدہ اٹھا۔

تیسرا بند

جس سمندر کی لہریں زیادہ سے زیادہ بلندی پر نہ پہنچتی ہوں اسے کون صحیح معنوں میں سمندر مانے گا؟ جس کی ہواؤں میں تندی اور تیزی نہیں، وہ طوفان کیونکر کہلا سکتا ہے؟ غافل افغان! تو اپنی خودی پہچان اس لیے کہ تو وہی سمندر ہے جس کی لہریں آسمان پر پہنچنی چاہئیں۔ تو وہی طوفان ہے جس کی تیز و تند ہواؤں سے دنیا بھر میں ہل چل مچ جانی چاہیے۔

چوتھا بند

کسان رات دن مٹی اوپر نیچے کر کے روزی پیدا کرتا ہے۔ جس شخص نے اپنے جسم کی مٹی کو اوپر نیچے کر کے اپنی حقیقت پا لی، اس کی کسانی اتنی بلند حیثیت رکھتی ہے کہ بادشاہی بھی اس پر قربان کر دینی چاہیے۔ اے غافل افغان

افرض بھی یہی ہے کہ اپنی حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرے اور اپنی خودی کو پہچانے۔

پانچواں بند

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تو موجودہ زمانے کے علم سے روشناس نہ ہو سکا اور بے علم رہا، لیکن خدا کی رحمت دیکھ کہ اس بے علمی ہی نے تیری آبرو رکھ لی۔ جو لوگ پڑھ پڑھا کر عالم فاضل بن گئے، ان کی حالت کیا ہے؟ یہ کہ وہ اپنا دین ایمان بیچ رہے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ تیرا دین ایمان محفوظ رہا۔ یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ تو نے موجودہ زمانے کے نظامِ تعلیم سے کوئی فائدہ نہ اٹھایا۔ اسے غافل! تو اپنی خودی کو پہچان اور وہ کارنامے انجام دے جو تجھ ایسے غیور مومن کے لیے زیبا ہیں۔

---۸---

زاغ: کوا۔ **شپرک:** چمگادڑ۔

۱۔ کوا جو خود بہت ہی بدصورت ہوتا ہے۔ شہباز سے کہتا ہے کہ تیرے پر نہایت بھونڈے معلوم ہوتے ہیں چمگادڑ جسے خود دن کے وقت کچھ نظر نہیں آتا، کہتی ہے کہ اے شہباز! تو اندھا ہے اور تجھ میں کچھ جوہر نظر نہیں آتا۔

۲۔ شاعر کہتا ہے: اے شہباز! ان نکتہ چینیوں کی پروانہ کر۔ کوے اور چمگادڑ کی حیثیت بیابانی پرندوں میں وہی ہے، جو ہندوؤں کی اونچی جاتیوں میں اچھوتوں کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ پرندے آسمانی فضا کے پیچ اور خم سے بالکل ناواقف ہیں۔

اچھوت سے مراد ہے جسے چھونا گناہ ہو۔ اونچی جاتیوں کے ہندوؤں نے جو آریا قوم سے تعلق رکھتے تھے، یہاں کے قدیم باشندوں کو اچھوت بنا دیا اور ان سے ذلیل کام لینے لگے۔ یہ سلسلہ ہزاروں سال جاری رہا۔ ان کی آبادیاں بھی علیحدہ ہوتی تھیں۔ یہ اصل میں رنگ اور نسل کا وہی تعصب تھا، جس پر یورپی قومیں آج بھی افریقہ اور امریکہ میں کاربند ہیں۔ اقبال کہتے ہیں کہ کوا، چمگادڑ اور اس قسم کے دوسرے پرندے پرندوں کے اچھوت ہیں اور ان

سے کسی اچھی اور بلند بات کی امید نہ رکھنی چاہیے۔

۴۔ ان اچھوتوں کو اس پرندے کے حالات اور رتبے کا کیا علم ہو سکتا ہے، جو اڑنے کے لیے پر تولتا ہے تو اس کی روحِ زندگی سر سے پاؤں تک نظر بن جاتی ہے۔ یہ شہباز کی حالت کا نقشہ ہے۔

۹

عنادل: عندلیب کی جمع۔ بلبل۔ **رحیل**، کوچ۔ **غلط انداز**: بے جانے بوجھے کہیں پڑنے والی نظر۔

۱۔ عشق کی فطرت ہوس کی طرح پست نہیں۔ شہباز کے پروں سے مکھی کی اڑان کا کام نہیں لیا جا سکتا۔

۲۔ باغ کے دستور کو بدلنے کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بلبلوں کے لیے گھونسلا بھی پنجرے کی طرح ناقابلِ برداشت ہو جائے۔ یعنی قید و بند کی حالت تو کسی کو بھی خوشگوار معلوم نہیں ہوتی اور آزادی کے جہاد میں قید و بند سے سابقہ پڑتا ہی رہتا ہے، لیکن جن لوگوں کو ایسی کسی آزمائش کی منزل پیش نہیں آئی اور وہ گھروں میں آرام اطمینان سے بیٹھے ہیں اگر وہ جوش و ہمت سے کام لیں اور اپنی نمائشی آزادی پر خوش ہو کر نہ بیٹھے رہیں اور سمجھ لیں کہ ان کی حالت قید و بند سے مختلف نہیں تو اس طرح بھی آزادی کی تحریک کو کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔

۳۔ جس شخص کے دل میں سفر کے لیے جوش، جذبہ اور آمادگی موجود ہو، وہ کوچ کی آواز کا انتظار نہیں کیا کرتا۔ لہروں کے قافلے کو دیکھو۔ کیا وہ اپنی روانگی کے لیے گھنٹی کی آواز کا منتظر رہتا ہے؟

مطلب یہ کہ لہروں میں چلنے کا جوش اور جذبہ ہے۔ وہ بغیر کسی سہارے کے ہر وقت رواں دواں رہتی ہیں۔

یہی کیفیت راہِ حق کے ہر مسافر کی ہونی چاہیے۔

۴۔ آج کل کی درس گاہوں میں جو نوجوان تعلیم پا رہے ہیں، اگرچہ بظاہر وہ زندہ نظر آتے ہیں، لیکن حقیقت میں مرے ہوئے ہیں۔ انھوں نے تھوڑی دیر کے لیے یورپ والوں سے سانس مانگ لیا ہے۔ اس کی بدولت زندہ معلوم ہوتے ہیں یعنی ان میں زندگی کا جو بھی جوہر نظر آتا ہے، وہ سراسر یورپ کا ہے۔ وہ اپنی میراث بالکل کھو بیٹھے ہیں، لہٰذا انھیں مردہ سمجھنا چاہیے۔

۵۔ اگر تجھے اپنے دل کی تربیت منظور ہے تو تیرے لیے کسی صاحب ایمان کی وہی نگاہ کافی ہے جو جانے بوجھے بغیر تجھ پر پڑ جائے۔ یعنی مومن کی بے ارادہ نگاہ بھی دل کی تربیت کے لیے بالکل کافی ہے۔

---۱۰---

غاب: جنگل، صحرا خصوصاً شیروں کے رہنے کا جنگل۔ **کراری:** کرار کی صفت۔ کرار بار بار حملہ کرنے والے کو کہتے ہیں اور حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کا ایک لقب بھی تھا۔

۱۔ وہی نوجوان قبیلے کی آنکھ کا تارا ہے جس کی جوانی ہر قسم کے داغ دھبے سے پاک ہو اور جس کا وار ہمیشہ کاری پڑے۔

۲۔ جنگ کا موقع پیش آجائے تو وہ جوش و جواں مردی میں جنگل کے شیروں سے بھی بڑھ جائے۔ صلح کی حالت میں وہ تاتار کے ہرن کی طرح خوبصورت اور بانکا نظر آئے۔

جنگ اور صلح میں مومن کی خصوصیتیں یہی ہوتی ہیں۔

۳۔ اگر اس کے دل کی حرارت سب میں آگ لگا دے تو اس پر حیران نہ ہونا چاہیے، اس لیے کہ سرکنڈوں کے جنگل کو آگ لگانے کی غرض سے ایک چنگاری بھی کافی ہے۔

۴۔ خدا نے اسے بادشاہوں کا سا دبدبہ اور شکوہ عطا کیا ہے، اس لیے کہ اس کی درویشی میں حیدری اور کراری کی شان نمایاں ہے۔

۵۔ اگر اس کے سر پر ٹوپی موجود نہیں تو اسے حقارت سے نہ دیکھ۔ یہی ننگے سر والا جوان تاج داری کا اصل سرمایہ ہے۔

۱۱

۱۔جس کے جلوے سے تیری گزری ہوئی رات روشن رہی، وہ بجھا ہوا چراغ دوبارہ جلایا جا سکتا ہے۔

۲۔جو شخص حوصلے اور ہمّت کی دولت سے بے بہرہ ہو، وہ ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھا ہوا زمانے کا گلہ شکوہ کرتا رہتا ہے، لیکن خدا کے آزاد بندے کی کیفیت کیا ہے؟ یہ کہ اگر تقدیر اس کے نشتر بھی چبھو دے تو اس کی خلش کو شہد کی طرح میٹھا سمجھ کر ہنسی خوشی گوارا کر لیتا ہے۔

مراد یہ ہے کہ زندگی میں اسے کتنی ہی تکلیفیں پیش آئیں، وہ نہ ہمّت ہارتا ہے، نہ کوشش اور تگ و دو ترک کرتا ہے۔نہ اپنے نصب العین سے الگ ہوتا ہے۔

۳۔وہ نوجوان لڑائی کے ہنگاموں میں کام نہیں دے سکتا، جو صبح کے وقت پرندوں کی فریاد سن کر ہوش و حواس کھو بیٹھے۔

۴۔مجھے ڈر ہے تو یہ کہ تیری طبیعت بچوں کی سی ہے جو مٹھائیاں پسند کرتے ہیں اور یورپ کے مٹھائی بیچنے والے بڑے مکّار ہیں۔

۱۲

لاطینی: اٹلی کی پرانی زبان۔ **لا غالب الّا ہو:** اللہ کے سوا کوئی غالب نہیں۔ **تقویم:** قیام۔ استحکام مضبوطی۔ **ترش ابرو:** خفا۔ ناراض۔

۱۔تو کیا لادینی اور لاطینی کے چکر میں پڑا ہوا ہے؟ کمزوروں کا علاج فقط ایک ہے اور وہ یہ کہ اللہ کے سوا کوئی غالب نہیں۔

مراد یہ ہے کہ ضعیف اور کمزور خدا کا سہارا لے کر اور اس کے حکموں کی پابندی کرتے ہوئے سربلندی کے مقام

پر پہنچتے ہیں، اس لیے کہ خدا کے سوا کوئی غلبہ عطا نہیں کر سکتا۔ جو لوگ اس کی رضا پر چلیں گے۔ وہی سرداری کے درجے پر پہنچیں گے۔ لیکن آج کل کی نا واقف قوموں نے یہ سمجھ لیا کہ یورپ کی طرح مذہب سے الگ رہ کر اور لاطینی کا رسم الخط اختیار کر کے ترقی کی منزلیں طے کی جا سکتی ہیں۔ جیسا کہ مصطفیٰ کمال کے ماتحت ترکی نے کیا۔ حالانکہ نہ ہر لا مذہب کو قوت و عروج حاصل ہے، نہ ہر وہ قوم سر بلند مانی جاتی ہے، جس نے لاطینی رسم الخط اختیار کر رکھا ہے

۲- جو شخص حقیقتوں کو شکار کرنا چاہیے، وہ یورپ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ اس سے بالکل مایوس ہے۔ اس لیے کہ وہاں کی فضا تو واقعی دلکش ہے لیکن وہاں کے ہرنوں میں نافہ نہیں ہوتا یعنی وہ معنویت سے خالی ہیں۔

۳- صبح کے وقت آنسو بہائے بغیر خودی کو مضبوط و مستحکم کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ پیکانی لالہ (خودی) ندی ہی کے کنار سے ترو تازہ رہتا ہے۔ اس شعر میں لالہ پیکانی کو خودی سے اشک سحر گاہی کو ندی سے تشبیہ دی ہے اشکِ سحر گاہی سے مراد وہ آنسو ہیں جو انسان علی الصباح ذکر الٰہی میں بہاتا ہے۔

۴- یہ پرانا مندر یعنی رنگ اور بو کا بت خانہ جسے دنیا کہتے ہیں، کافروں کا شکاری ہے اور مومن کا شکار۔ مطلب یہ ہے کہ کافر اپنی پوری زندگی اس دنیا کی رنگینیوں اور دلآویزیوں میں بسر کر دیتے ہیں اور دنیا ہی ان کا نصب العین ہوتی ہے۔ لہٰذا وہ دنیا کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن مومن اس دنیا کو خدا کی رضا کے مطابق چلاتا ہے اس لیے دنیا اس کا شکار رہتی ہے۔

۵- اے شیخ! امیروں کو مسجد سے نکلوا دے۔ ان کی نمازوں سے مسجد کی محرابیں خفا اور ناراض ہیں۔

۱۳

۱- مجھے تو یہ دنیا بدلتی اور تہ و بالا ہوتی نظر آتی ہے۔ معلوم نہیں تجھے کیا نظر آتا ہے؟

۲- جوانوں کے افکار و خیالات اس طرح بدل گئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے، ہر سینے میں قیامت کی صبح نمودار ہو رہی ہے۔ یعنی ایسا انقلاب آ رہا ہے جو روزِ قیامت کے انقلاب کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔

۳- اے کعبے کے پیر! اے مذہب کے پیشوا! تو صبح کے وقت جو مناجات پڑھتا ہے، کیا وہ اس

زندگی کی تلافی کرسکتی ہے جو جنگ وجدال کے بغیر بسر ہوئی ؟

مراد یہ ہے کہ اس دنیا میں باطل سے ٹکر لیے بغیر چارہ نہیں۔ اسی غرض سے ساز و سامان اور اسباب فراہم کرنے چاہئیں۔ مسلمان اس طرف سے غافل ہیں۔ اقبال فرماتے ہیں کہ صرف مناجاتوں سے تو کام نہیں چل سکتا۔ محض دُعائیں تو حق و باطل کی جنگ میں کامیابی نہیں دلا سکتیں۔

۴۔ خودی خانقاہوں میں تربیت نہیں پا سکتی۔ خانقاہوں کی حیثیت اس شعلے کی سی ہے، جس پر نمی کا اثر ہو چکا ہو ایسے شعلے سے چنگاری کیا نکلے گی ؟

۱۴

ید اللّٰھی : ید اللہ سے منسوب جس کے معنی ہیں خدا کا ہاتھ۔ عشق ید اللّٰھی، عشقِ حق۔

۱۔ جو عشق رندانہ جرات سے خالی ہو، اسے روباہی سمجھنا چاہیے، یعنی لومڑی کی طرح مکر و فریب پر گزارہ کرنا جس کے بازو میں قوت ہو اور جس کے پہلو میں جرات و ہمت موجود ہو، اسی کا عشق حقیقی معنی میں عشقِ حق کہلاتا ہے۔

۲۔ جو مسافر راستے کی سختیوں اور مصیبتوں کو اپنے سفر کا سامان سمجھ لے۔ یعنی اس سفر کے لیے تیار نہ ہو جو سختیوں اور مصیبتوں سے خالی ہو، وہ مسافر اب کہیں نظر نہیں آتا۔ افسوس کہ سب لوگ آرام طلب بن گئے، جفاکشی اور جاں بازی کے جوہر ناپید ہو گئے۔

۳۔ اے میدان میں رہنے والے! اگر میں کہتا ہوں کہ پہاڑوں کی تنہائی میں بیٹھنا چاہیے تو اس کا مطلب یہ نہ سمجھ کہ یہ وحشت کی تعلیم ہے اور میری خواہش یہ ہے کہ تو انسانوں سے دور بھاگے۔ ہرگز نہیں۔ پہاڑوں کی تنہائی میں انسان اپنے آپ کو پہچاننے کی تعلیم حاصل کرتا ہے۔

۴۔ دنیا روایات کی پابند ہے۔ عقبیٰ میں مناجات کے سوا کچھ نہیں۔ تو ان دونوں دنیاؤں سے علیحدگی اختیار کرکے صرف محبوبِ حقیقی کا دامن تھام لے۔ یہی اصلی شہنشاہی ہے۔

۱۵

۱۔ اسے سیر و سلوک کی راہ پر چلنے والے! فقیری اور درویشی کا علم مشکل نہیں۔ اگر تو غور کرے تو انسان کا ضمیر اس کے حق ہونے کی گواہی دے رہا ہے۔

۲۔ اگر لوہے کی طبیعت میں ریشم کا خاصہ پیدا ہو جائے تو وہ تلوار بنانے کے لائق نہیں رہتا۔

۳۔ اگر درویشی خوددارانہ ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ خدا کا قہر ہے۔ درویش غیرت مند ہو تو یقین رکھو کہ اس کی سرداری اور حکمرانی کی یہ پہلی منزل ہے۔

۴۔ افسوس اے مومن! یورپ نے تجھے تیری حقیقت سے بے خبر کر دیا، ورنہ تو ہی دنیا کو نیک کاموں کے اچھے اجر کی خوشخبری سنانے والا ہے اور تو ہی انھیں بُرے کاموں کے انجام بد سے ڈرانے والا ہے۔

۱۶

ملبوس: لباس۔ حنائی: مہندی کے رنگ کا۔ شرح۔

۱۔ قوموں کے لیے مرکز سے جدا ہونا موت کا پیغام ہے۔ اگر خودی صاحب مرکز بن جائے تو خدائی صفات پیدا کر لیتی ہے

۲۔ جو درویشی زمانے کی تلخیوں کا گلہ زبان پر لائے، سمجھ لینا چاہیے کہ اس درویشی میں بھیک مانگنے کا خاصہ ابھی تک باقی ہے۔

۳۔ اگرچہ موجودہ زمانہ مردانِ حق سے خالی نظر آتا ہے، لیکن اب بھی ایسی ہستیاں مل سکتی ہیں، جن کا معجزہ پہاڑ کو رائی بنا سکتا ہے۔ یعنی ایسے لوگ اب بھی میسر آ سکتے ہیں جو بڑی بڑی طاقتوں اور قوتوں کو بے حقیقت بنا کر رکھ دیں

۴۔ اسے ایمان والے بندے! تو کہاں ہے؟ تیرے سوز اور تیری حرارت کے بغیر جنگ و جدل میں کوئی لذت نہیں پائی جاتی۔

مراد یہ ہے کہ صاحب ایمان جنگ کرتا ہے تو اس کے سامنے باری تعالیٰ کی رضا کے سوا کچھ نہیں ہوتا، ماالمقصد ا
ایسی جنگ کے بغیر لذت کہاں نصیب ہو سکتی ہے؟

۵۔ اے سورج! تو مشرق کے پردے سے نکل اور میرے پہاڑ کو سُرخ لباس پہنا دے۔

سُورج طلوع کے قریب ہوتا ہے تو مشرق کے افق پر شفق پھول جاتی ہے۔ اس کی سُرخی کا عکس پہاڑوں پہ پڑتا ہے تو ان میں ایک دل آویز سُرخی جھلکنے لگتی ہے۔ جس شخص نے پہاڑوں میں سُورج کے نکلنے کا نظارہ دیکھا ہے اسے معلوم ہوگا کہ جب ابتدائی کرنیں پہاڑ کی بلند چوٹیوں پر پہلے پہل نمودار ہوتی ہیں تو ان میں بھی گہری سُرخی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ گویا اس شعر میں اقبال نے منظر کشی کا کمال دکھایا ہے۔

شعر میں سُورج سے مراد بندۂ مومن ہے جس کی تمنّا اس سے پہلے شعر میں کی گئی ہے۔ میرے پہاڑ سے مراد محراب گل افغان کا وطن ہے۔ یعنی محراب گل اس بات کا آرزومند ہے کہ کوئی بندۂ مومن پیدا ہو اور کوہستانی علاقے میں زندگی کی رُوح پھونک دے۔

۱۷

بَرنا و پیر: جوان اور بوڑھے۔ **سرنوشت:** قسمت۔ تقدیر۔ **پر کُشا:** پر تولنے والی۔

۱۔ اگر لاکھوں میں ایک بھی ایسا فرد موجود ہو، جسے صاحب یقین کہا جا سکے تو وہ اپنی آگ سے جوانوں اور بوڑھوں میں عشقِ حق کی حرارت پیدا کر دیتا ہے۔

۲۔ پہاڑوں اور بیابانوں میں وہ مردِ حق کبھی کبھی پیدا ہوتا ہے، جس کی درویشی ٹھیکری کو نگینہ بنا سکتی ہے۔ یعنی پستی میں گری ہوئی قوموں کو اٹھا کر اوج و عروج کی بلندی پر پہنچا سکتی ہے۔

۳۔ اے مخاطب! تو اپنے قلم سے اپنی قسمت آپ لکھ لے۔ خدا کے قلم نے تیری پیشانی بالکل صاف رکھی ہے اور اس پر کچھ نہیں لکھا۔

مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں انسان ہمّت و جواں مردی سے جو کچھ کرے گا، وہی اس کی قسمت بن جائے گی۔

خدا نے انسان کو صلاحیتیں دے رکھی ہیں۔ اسے چاہیے کہ ان صلاحیتوں سے کام لے۔

۴۔ یہ نیلی فضا جسے آسمان کہتے ہیں، اگرچہ بہت بلند معلوم ہوتا ہے، لیکن ہمّت پر تولنے کے لیے تیار ہو تو اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں۔

۵۔ جب تک یہ سر پر رہتا ہے، اس کا نام آسمان ہے۔ جب یہ پروں کے نیچے ہو جائے تو اس کا نام زمین ہو جائے گا۔

۱۸

شیر شاہ سوری: اصل نام فرید خاں تھا۔ معمولی حیثیت سے اٹھ کر ترقی کی منزلیں طے کرنے لگا۔ ایک امیر کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔ اس نے شیر مار نے پر اسے شیر خاں کا خطاب دے دیا۔ بعد میں ایک چھوٹی سی ریاست قائم کر لی۔ آہستہ آہستہ افغانوں کے لشکر تیار کر لیے۔ پھر دو لڑائیوں میں ہمایوں کو شکست دے کر ہندوستان کا شہنشاہ بن گیا۔ عوام کی بہتری کے لیے جو ہمیشہ زندہ رہنے والے کارنامے انجام دیے، ان کے ذریعے سے عالمگیر شہرت پائی۔ اس کی قائم کی ہوئی افغانی سلطنت صرف پندرہ سولہ سال باقی رہی۔ **وزیری و محسودی:** دو افغان قبیلے۔

۱۔ شیر شاہ سوری نے یہ پتے کی بات کر دی کہ قبیلوں کا امتیاز سخت ذلت و خواری کا باعث ہے۔

۲۔ افغانوں کو وزیری اور محسودی کے نام بہت پیارے لگتے ہیں۔ سمجھنا چاہیے کہ وہ ابھی تک افغانیت کا خلعت پہننے کے لائق نہیں ہوئے۔ یعنی جب تک قبیلے مٹ کر قوم کا جزو نہ بنیں گے، اس وقت تک قوم کیونکر پیدا ہوگی؟

۳۔ پہاڑوں کے مسلمان ہزاروں ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہیں اور ہر قبیلے نے اپنے بتوں کا زنّار پہن رکھا ہے۔ یعنی ہر قبیلہ اپنی حیثیت قائم رکھنے پر تُلا بیٹھا ہے۔ افغان قوم کی حیثیت بلند کرنے کا کسی کو خیال نہیں۔

۴۔ یہ وہی نظارہ ہے جو اسلام سے پہلے عرب میں رونما تھا۔ یعنی کعبہ موجود تھا۔ اس کے ساتھ لات اور منات وغیرہ بتوں کی بھی پوجا ہوتی تھی۔ سرحد کے پہاڑی علاقے میں مسلمان موجود ہیں لیکن اپنے قبیلوں کی شان قائم رکھنے کے لیے وہ قومی مقاصد سے بے پروا ہو گئے ہیں۔ خدا کرے کہ تجھے کاری وار کا موقع مل جائے تاکہ قبیلوں کے بُت ٹوٹ جائیں اور تمام افغان ایک قوم کی حیثیت اختیار کر کے عظیم الشان کارنامے انجام دیں۔

۱۹

گلیم پوش: گدڑی پہننے والا۔

۱۔ اصلی نگاہ وہ نہیں جو سُرخ اور زرد رنگ میں تمیز کرے۔ یہ نگاہ سورج اور چاند کی روشنی میں کام کر سکتی ہے۔ اصلی نگاہ وہ ہے جو سورج اور چاند کی روشنی کی بھی محتاج نہ رہے۔

۲۔ مومن کی منزلِ مقصود یورپ سے بہت آگے ہے۔ تُو قدم اٹھا یورپ نے جو کچھ پیدا کیا ہے۔ یعنی ریڈیو، لاسلکی وغیرہ، اس پر راستہ ختم نہیں ہو جاتا۔ اس سے آگے بھی بہت سی منزلیں ہیں اور مومن کی شان تو یہ ہے کہ اس دنیا کے ذرّے ذرّے کو خدا کی رضا کا پابند بنا دے۔ یہ کام ان ایجادوں سے پورا نہیں ہو سکتا جو یورپ کے سائنس دانوں نے کیں۔

۳۔ اہلِ یورپ نے علوم کے جو شراب خانے قائم کر رکھے ہیں، ان کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں اور ان علوم کی سرمستیاں بھی گناہ نہیں یعنی ان سے جتنا فائدہ چاہو، اٹھاؤ۔

۴۔ لیکن اگر تم میں توحید کی حرارت باقی نہیں تو سمجھ لو کہ ان علوم کی مستی تمھیں موت کے گھاٹ بھی اتار دے سکتی ہے۔

مراد یہ ہے کہ مسلمان کو توحید میں پختہ ہونا چاہیے جو دینِ حق کی بنیاد ہے۔ اسے علوم بھی صرف اس غرض سے سیکھنے چاہئیں کہ توحید کے مقاصد کو بہتر طریق پر پورا کر سکے۔ اگر مسلمان کا دل اس نور سے خالی ہو تو پھر یورپ کے علوم اسے گمراہ کر کے موت کی منزل میں پہنچا دیں گے۔

۵۔ محراب گل کہتا ہے کہ اگرچہ میں گدڑی پہنے ہوئے ہوں جو ایک غریب و مسکین کا لباس ہے کوئی بڑا سردار اور امیر نہیں، لیکن کیا میں اُمید کر سکتا ہوں کہ بڑے بڑے خانوں کے فرزند میری اس درد بھری صدا کو دل کے کانوں سے سنیں گے؟

———۲۰———

۱۔ فطری مقاصد کی حفاظت کرنے والے صرف دو گروہ ہیں۔ یا وہ لوگ جو بیابانوں میں رہتے ہیں یا وہ لوگ جو

پہاڑوں میں زندگیاں گزارتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ بیابانوں اور پہاڑوں میں رہنے والے لوگ زیادہ جفاکش اور ہمت ور ہوتے ہیں۔ انھیں روزی پیدا کرنے کے لیے بے شمار مشقتیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ اس وجہ سے وہ شہروں اور باغوں میں رہنے والے لوگوں کے مقابلے میں آسانی سے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شہروں اور باغوں میں رہنے والے لوگ تن آسان، عیش پسند اور آرام طلب ہو جاتے ہیں اور وہ فطرت کے مقاصد کو پورا نہیں کر سکتے، لہٰذا بدوی اور پہاڑی قومیں حکومت کی باگ ڈور ان سے چھین لیتی ہیں اور خود فطری مقاصد کی حفاظت شروع کر دیتی ہیں۔ تاریخ کا عام سبق یہی ہے۔ بڑی بڑی اور طاقتور سلطنتیں بے سروسامان بدویوں اور کوہستانیوں کے مقابلے میں ناکام رہ گئیں۔ اس لیے کہ ان میں فطرت کے مقاصد کی حفاظت کا کوئی جوہر نہ تھا۔ فطرت کا مقصد یہ ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ جفاکش، محنتی، تن دہ اور ہمت ور ہو۔

۲۔ یہی لوگ ہیں جو افسون پھونکنے والی تہذیب کا حساب کتاب لیتے ہیں اور اس کی اچھائی برائی پرکھ کر الگ الگ کر دیتے ہیں۔ انھیں کی فقیری میں بادشاہی کا سروسامان موجود ہوتا ہے۔

۳۔ مثال کے طور پر دیکھو۔ بلبل باغ میں رہتی ہے اور اس کا خاصہ حسن و لطافت کے سوا کچھ نہیں۔ شہباز کا بسیرا بیابانوں میں ہوتا ہے۔ اس میں قوت بھی ہوتی ہے اور شان و شوکت بھی۔

۴۔ اے شیخ! درس گاہ کی فضا بہت اچھی سہی جو کچھ یہاں پڑھایا جاتا ہے، مانے لیتا ہوں کہ وہ بھی فائدے سے خالی نہیں، لیکن یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ حضرت فاروق اعظم (رضی اللہ عنہ) اور حضرت سلمانؓ فارسی جیسی جلیل القدر ہستیاں درس گاہوں میں نہیں بنتیں۔ یہ بیابانوں ہی کی ہوا میں تربیت پاتی ہیں۔

۵۔ اسلام کی شراب تیزی میں تلوار ہے۔ اسے پینے والا صدیوں کے بعد پیدا ہوتا ہے[1]۔

---

[1] یہ حقیقت محتاج تصریح نہیں کہ محراب گل نے جو کچھ کہا ہے وہ صرف افغانوں کے لیے نہیں بلکہ اس میں پوری ملت کے لیے بھی بہترین سبق موجود ہے۔